Scanned by CamScanner

رب لامکاں کا صد شکر ہے کہ اس نے ہمیں توفیق دی کہ ہم اردو ادب کی کتب کو سافٹ میں تبدیل کر سکے۔ اسی صورت میں یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ مزید اس طرح کی عمدہ کتب حاصل کرنے کے لئے ہمارے گروپ میں شمولیت اختیار کریں۔

انتظامیہ برقی کتب

گروپ میں شمولیت کے لئے:

عبداللہ عتیق: 8848884 347 -92+

محمد ذوالقرنین حیدر: 3123050300-92+

اسکالر سدرہ طاہر صاحبہ: 0120123 334 -92+

ڈاکٹر محمد شیراز دستی انگریزی زبان وادب میں پی۔ایچ۔ڈی اور پوسٹ ڈاکٹریٹ ہیں اور آج کل بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد کے شعبۂ انگریزی میں تدریسی اور انتظامی امور کی انجام دہی میں مصروف ہیں۔آپ امریکہ کی یونی ورسٹی آف کولوراڈو، بولڈر سے بھی بہ طور لیکچرار وابستہ رہے ہیں نیز قائدِ اعظم یونی ورسٹی، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، ایئر یونی ورسٹی اور نمل میں بھی تدریسی خدمات سرانجام دے چکے ہیں۔آپ کی انگریزی کہانیاں براؤن یونی ورسٹی کے جریدے "ویژنز" اور پاکستانی لوک داستانوں کے مختصر انگریزی تراجم یونی ورسٹی آف نارتھ ٹیکسس کے جرنل "پاکستانیات" سے شائع ہو چکے ہیں۔آپ بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد کے دو تحقیقی مجلّات، "معیار" اور "جرنل آف کنٹمپوریری پوئٹکس" (JCP) کے معاون مدیر ہیں۔تخلیق، ترجمہ اور لسانیات آپ کی دل چسپی کے خصوصی میدان ہیں اور ان سے متعلق نہ صرف آپ کے متعدد مقالات ادبی اور تحقیقی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں بل کہ "Hour of Decline" (۲۰۱۴ء)، "مغل سرائے" (۲۰۱۵ء) اور "نسلوں نے سزا پائی" (۲۰۱۶ء) کے عنوانات سے آپ کی تین تصانیف بھی منظر عام پر آ چکی ہیں۔

A Tale of Widening Civilizational and Economic Divides

ناول

محمد شیراز دستی

AKSPUBLICATIONS

ISBN
9789697812158

کتاب	ساسا
مصنف:	محمد شیراز دستی
سن طباعت	2018ء
تعداد	600
قیمت	800

عکس
AKSPUBLICATIONS
Book Street, Data Darbar Market, Lahore.
Ph:042-37300584,Cell # 0300-4827600-0348-4078844
E-mail:publications.aks@gmail.com

انتساب

ساده
کے
نام

''کا چاہیے؟''

''محبت۔''

''کاہے؟''

''جندہ رہن کا واسطے۔''

''کب چاہیے؟''

''سانس، سانس پر۔''

''کیسی چاہیے؟''

''ہیں!! قسمیں ہوتیں کا؟''

معاصر زندگی کی سیاسی، ثقافتی اور میڈیائی حقیقتوں کا استعارہ: "ساسا"

اسلام آباد کی ایک سرکاری یونیورسٹی میں انگریزی ادبیات کے استاد محمد شیراز دستی کی کوئی اردو تحریر اس سے پہلے میری نظر سے نہیں گزری۔ جب انھوں نے مجھے اپنے اردو ناول ''ساسا'' کا مسودہ پڑھنے کے لیے دیا تو میں خاصا حیران ہوا۔ اس وقت انگریزی زبان وادبیات سے وابستہ نئی نسل یا تو انگریزی میں ناول لکھ رہی ہے یا پاکستانی انگریزی میں لکھے گئے ناولوں پر تحقیق و تنقید سے اپنی ادبی شناخت قائم و مستحکم کر رہی ہے۔ ایسے میں شیراز دستی صاحب کا اردو میں ناول لکھنا حیرت کا باعث نہیں ہوگا تو کیا ہوگا۔ لیکن شیراز دستی ہوا کے مخالف رخ کیوں چلے ہیں؟ اس کا جواب ناول پڑھنے سے مل سکتا ہے۔ ''ساسا'' (ناول میں ایک پرندے کو دیا گیا نام) کا 'تھیم' وہی ہے جسے ہم دنیا کے اکثر بڑے ناولوں میں دیکھتے ہیں: یعنی تلاش۔ اسے ڈیرہ غازی خان کے ایک قصبے کے نوجوان سلیم کی کہانی کے ذریعے پیش کیا گیا ہے؛ اسے محبت کی تلاش ہے۔ وہ اپنی تلاش کا آغاز اپنے گاؤں سے کرتا ہے اور گاؤں ہی میں اسے ختم کرتا ہے۔ بہ ظاہر یہ ایک عام سی کہانی ہے اور سلیم کا سفر دائرے کا ہے، مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ محبت کی تلاش، سلیم کو معاصر زندگی کی سب چھوٹی بڑی سیاسی، ثقافتی، میڈیائی حقیقتوں سے متعارف کرواتی ہے۔ کس طرح مابعد گیارہ ستمبر دنیا میں سب پاکستانی شناخت کی سیاست کا شکار ہوتے ہیں اور ان جرائم میں ملوث سمجھے جانے لگتے ہیں جو انھوں نے کیے ہی نہیں؛ کس طرح پاک بھارت تعلقات (جن کا تصور ہم نصابات کے ذریعے کرتے ہیں) دونوں ملکوں کے شہریوں کے روزمرہ رویوں پر اثرانداز ہوتے ہیں؛ کس طرح سلیم کا شعور امریکی اور پاکستانی یا عالمی و مقامی دنیاؤں کا مقابلہ کرنے اور انھیں سمجھنے کی کوشش کرنے میں مسلسل

حال وماضی کے منطقوں میں محوِ سفر رہتا ہے؛ کس طرح اسی دوران میں وہ انسانی حقوق، شہری آزادیوں اور عمومی انسانی صورت حال سے متعلق دونوں دنیاؤں کے فرق اور عالمی دنیا کے تضادات سے آگاہ ہوتا ہے اور کس طرح آدمی کی روح کی سب سے توانا آرزو یعنی محبت...اور وہ بھی عورت مرد کی نہایت پرجوش محبت معاصر عہد کے قومی و ثقافتی بیانیوں کے تحت اور ذریعے اظہار کرتی ہے اور کس طرح انسانی روح اپنی نجات، اپنی ثقافتی روح سے ہم آہنگ ہونے میں دیکھتی ہے... یہ سب "ساسا" کو منفرد حیثیت عطا کرتا ہے۔ یوں محبت کی تلاش ،اندر اور باہر کی حقیقی دنیاؤں کی خاک چھاننے یعنی انھیں جاننے اور اس علم کو باقاعدہ جھیلنے کا ذریعہ بنتی ہے، اور یہ چیز محبت کو محض مرد عورت کے وصال سے کہیں آگے کی چیز بناتی ہے۔ واضح رہے کہ اپنی ثقافت سے جڑے رہنے.... اور اس 'پہلی دنیا' کے اندر سفر کر کے اور اس کا علم حاصل کر کے، جس نے ہماری دنیا کو 'تیسری دنیا' قرار دیا تھا، اپنی ثقافت سے از سر نو جڑنا دو مختلف باتیں ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ مصنف نے کہیں اپنی ثقافت کے قصیدے پڑھے ہیں نہ اسے مغربی دنیا کے مقابلے میں کمتر کہا ہے، صرف فرق واضح کیا ہے اور کرداروں کو ایک ایسی نفسی وجودی صورت حال میں مبتلا دکھایا ہے جس میں وہ اپنی ثقافت کی بازیافت کو اپنی نجات کے مماثل تصور کرتے ہیں۔ یہ سب اس ناول کو معاصر اردو ناولوں میں اہم حیثیت عطا کرتا ہے۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیّر

افسانہ نگار، مضمون نگار، نقاد

ڈائریکٹر جنرل، اردو سائنس بورڈ

﴿۱﴾

میرے گاؤں کے آج کل کے بچے تو خیر اپنے اسمارٹ فونوں کی طرح خاصے تیز ہوتے ہیں مگر جب ہم چھوٹے ہوتے تھے تو اس قدر سادے تھے کہ گُودے کر گُو ہا لے آتے تھے۔

موسمِ بہار کے ایک دن ماسٹر جی کہیں سے ایک ہفتے کا کوئی کورس کر کے واپس آئے تو ہم سب کو اسکول کے گراؤنڈ میں لے گئے۔ ہم حسبِ اُصول قد کی ترتیب سے پروئی ہوئی ایک قطار میں جُڑ گئے تو کہنے لگے: "ارے بچو، سنو آج ہم ایک کھیل کھیلیں گے۔" کھیل کا ذکر سنتے ہی میرا دِل کِھل اُٹھا۔ "اِس کا عنوان ہے 'تلاشِ گم شدہ'۔ ہمارے گاؤں کی تیس پینتیس چیزیں گم ہو گئی ہیں۔ ان سب کے نام ان پرچیوں پر لکھے ہوئے ہیں۔" اُنہوں نے بُھر بُھری زمین پر پڑے ایک ڈِبے کی طرف اشارہ کیا جس میں قرعہ اندازی کے لیے تیار رنگ برنگی پرچیاں لپٹی پڑی تھیں۔ "باری باری سب ایک ایک پرچی اٹھایئے اور اس پر لکھی چیز ہمیں بتاتے جایئے تاکہ ہم اپنے پاس درج کر لیں۔" اُنہوں نے واسکٹ کی جیب سے ایک کاغذ اور قلم نکالتے ہوئے کہا۔ "پھر جایئے اور آدھی چھٹی سے پہلے پہلے اپنے ذمے کی چیز کا پتہ ڈھونڈ لایئے۔ شاباش، شاباش۔"

سب سے پہلی باری سب سے چھوٹے قد کے مالک سادے کی تھی؛ مَیں سب سے

آخر میں کھڑا بے صبری سے اپنی باری کا منتظر تھا۔ کسی پرچی پر 'نیکی' لکھا تھا تو کسی پر 'سکون'، کسی پر 'غیرت'، تو کسی پر 'تمیز'۔ سب نے ایک ایک پرچی اٹھالی۔

میری باری آئی تو ڈِبے میں نیلے رنگ کی ایک ہی پرچی رہ گئی تھی جس پر مدھم سی روشنائی سے لکھا تھا:

''محبت!''

اپنے اپنے حصے کی پرچی اٹھا کر سب بچے اسکول سے باہر آ گئے۔ کچھ کھیتوں کی طرف چلے گئے اور کچھ گاؤں کو، تاکہ جا کر لوگوں سے پوچھیں کہ انھیں یہ گم شدہ چیزیں کدھر سے ملیں گی۔

اب تو خیر میں اس موضوع پر ایک جملہ بھی کہوں تو مکتبِ محبت کا نصاب ٹھہرے مگر چوتھی جماعت میں محبت مجھے شفقت اور عنایت وغیرہ کی کوئی بہن بھرجائی لگ رہی تھی۔ شاید لاشعوری پن کے اسی بچے نے میرا رخ کھیتوں کے بجائے گاؤں کی طرف موڑ دیا جس کی باگ ڈور دن کے اس پہر کو خواتین کے ہاتھ ہوا کرتی تھی۔ بھاگتا بھاگتا میں گاؤں کی چوڑی گلی میں آ گیا جو ہر آنے جانے والے کا سایہ اُس کے پیچھے سمیٹتی جا رہی تھی۔

''چچی آپ نے محبت تو نہیں دیکھی؟'' میں نے ایک عورت سے پوچھا جو گھر کی ڈیوڑھی سے باہر جھانک کر نہیں معلوم کیا دیکھنے آئی تھی۔ میرے سوال پر جھنجھلا کر اس نے پہلے تو دونوں ہاتھوں کے پنجوں سے لعنت کھول کر مجھ پر تنی اور پھر یوں جلدی سے پلٹ گئی جیسے میں نے اس کی کوئی چوری پکڑ لی ہو۔

میں آگے بڑھا تو ایک بڑھیا بالن کے لیے خشک لکڑیوں کی ایک گٹھڑی بائیں بغل میں دبائے، اونچی اونچی آواز میں گلی کے فرش پر لگے جوتوں کے نشانوں سے باتیں اور دائیں ہاتھ سے اشارے کرتی ہولے ہولے چلتی آ رہی تھی۔ قریب پہنچ کر میں نے پوچھا: ''دادی، آپ نے محبت کو دیکھا ہے؟''

''کیا آ آ آ آ؟'' بڑھیا نے کان پر ہاتھ رکھ کر بلند آواز میں کہا۔

''محبت کہاں ہے محبت؟''

''کچھ جان ہو تو اُونچا بول سکو۔ کیا کہتے ہو خبر نہیں۔'' بڑھیا نے اونچی آواز میں کہا اور چل دی۔ میں بھی اس کے ساتھ چلنے لگا۔ دو تین قدم تو بڑھیا کو میری اس ہم سفری کی خبر نہ ہوئی مگر پھر میں اس کے آگے آیا تو وہ ڈر سی گئی۔

''کیوں پیچھے پڑ گئے ہو؟؟'' اُس نے دادیا کے کہا۔

''محبت کدھر ہے محبت؟۔۔۔محبت کدھر ہے محبت؟۔۔۔محبت کدھر ہے محبت؟۔۔۔۔'' میں نے تین چار بار بڑھیا کے کانوں کی طرف اچھل اچھل کر کہا تو اردگرد کی دیواروں پر عورتوں کے سر یوں اُگ آئے جیسے صورِ اسرافیل پھونک دیا گیا ہو۔

''بکریاں کھول گئے، کیوں ں ں ں ں؟'' بڑھیا نے جو سمجھا اسی کا جواب دے دیا۔

وہاں سے ذرا آگے منزہ کے دادا کی بیٹھک تھی۔ وہ برآمدے میں پڑی چارپائی پر بیٹھے، حقے کو اپنے پاؤں کی قینچی میں پھنسائے کش لگانے میں یوں مگن تھے جیسے دنیا فتح کر کے بیٹھے ہوں اور یہ حقہ نہیں مالِ غنیمت میں آئی باندی ہو۔ ان سے بات کرتے ہوئے میں ہمیشہ دوہرے خوف کا شکار ہوتا تھا۔ کچھ تو ان کا اپنا ڈر اور کچھ ابو جی کا۔ منزہ کے دادا پہلے کھُسہ استعمال کرتے۔ لگ جاتا تو ٹھیک، چُوک جاتا تو سیدھے جا کر ابو جی سے شکایت کرتے اور ابو جی ان کی شکایت پر اتنے سیخ پا ہوتے کہ کم از کم دو تین دن تک مجھ سے کلام نہ کرتے۔ اٹھتے بیٹھتے امی جی کو سناتے رہتے: ''اپنے شہزادے کو سمجھاتی کیوں نہیں۔ ملک شمشیر علی پھر آئے ہیں ہمارے در پہ۔ اور تھوڑے بچے ہیں اس گاؤں میں کھیل کود کے لیے؟ علی کے ساتھ لڑائیاں اور پرائی دھی کے ساتھ دوستیاں۔۔۔''

''دادا مجھے محبت کہاں سے ملے گی؟'' میں نے جملہ یوں جلدی سے بولا جیسے لوگ آج کل قیام میں فاتحہ پڑھتے ہیں۔

''ہائیں؟'' منزہ کے دادا نے گرج کر کہا۔ غصے میں دونوں ہاتھوں سے چارپائی کو پکڑا، حقہ گر کر زمین پر پڑے دو کھسوں کے درمیان جا بیٹھا۔ آنکھیں یوں باہر آئیں کہ مجھے لگا ابھی ان کی گھنی سیاہ بھووں کی کمان سے چھوٹ کر میرے ماتھے پہ آ لگیں گی۔

''محبت؟'' اُن کی آواز مجھے اپنے پیچھے والی دیوار سے آتی سنائی دی۔ ''میں نے پہلے ہی کہا تھا سکینہ سے کہ منزہ کو اس اُوباش سے دور رکھ۔ ابھی دیتا ہوں تجھے محبت۔۔۔ رک میں تیرے دات میں دیتا ہوں محبت۔۔۔ ٹھہر میں تیری نانی کی دھوتی میں بجاتا ہوں محبت کا ڈھول......'' اسی طرح کی کچھ اور چیزیں کرنے کا عہد کرتے ہوئے وہ اٹھے، کھسہ اٹھایا، میرے پیچھے دوڑے اور پھر میرا نشانہ باندھ کر دے مارا......

کُھسہ میرے کندھے کو چھوتا ہوا میرے سامنے جا گرا۔ میں نے جھوٹ موٹ کی اُوئی اُوئی تو کی مگر شکر ہے کہ کھسہ چھپاک کر کے بھی نہیں لگا کہ تلاشِ محبت کا مشن نامکمل چھوڑنا پڑتا اور سرے سے میل دور بھی نہیں گزرا کہ منزہ کے دادا میری شکایت لگا سکتے۔

اسی طرح کے دو چار اور بُجے، کھسے اور گالیاں وغیرہ کھا کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ محبت کو ڈھونڈنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ سو گاؤں سے خالی ہاتھ واپس اسکول کو چل دیا۔ اب مجھے قطار میں سب سے آگے کھڑے سادہ کے نصیب پر رشک آ رہا تھا جس کی پرچی پر 'نیکی' لکھا ہوا تھا۔ اُس پانچ وقت کے نمازی سے بہتر کون جان سکتا تھا کہ نیکی کدھر ہے۔

میں ہانپتا کانپتا واپس اسکول پہنچا تو آدھی چھٹی کی گھنٹی بج رہی تھی اور بچے قطار میں اپنے قدم ملا رہے تھے۔ بے دِلے قدم اٹھاتا میں گراؤنڈ میں داخل ہوا اور جا کر قطار کو مکمل کیا۔

''ہاں بھئی بتایئے پھر مل گئیں سب گم شدہ متاعیں؟'' ماسٹر جی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''جی ماسٹر جی'' تقریباً سبھی نے جوش سے کہا۔ ''شاباش، شاباش''، ماسٹر جی نے ستائش کی، ناموں والی فہرست کھولی اور ایک ایک سے پوچھنے لگے:

''سادہ، نیکی کہاں ہے؟''

سادہ کا نام تو محمد صادق تھا مگر گاؤں والے اسے سادہ سادہ کہتے تھے، جو اس کی غریبی پہ یوں جچا کہ مٹیالے رنگ کی اکلوتی قمیص کی طرح اس کی جلد سے چپک کر رہ گیا۔

''استاد جی، مسجد میں۔'' سادہ نے فوراً کہا۔

''شاباش میرا لائق بچہ! اظہر، آپ کو سکون ملا؟''

''جی ماسٹر جی، مل گیا۔ وہ مدینے پاک میں ہے، ماسٹر جی۔''

''شاباش!! وقار، پیسہ کہاں ہے؟''

''بینکوں میں ہے، اُستا جی۔'' وقار نے 'اُستاد' کی 'د' کھا کر کہا۔

''اور تمیز؟''

''عورتوں میں۔'' نزلے موچی نے چھینک کی سی تیزی سے کہا۔

''اور غیرت'' ماسٹر جی نے اختر سے پوچھا۔

''مردوں میں، استاد جی، مردوں میں۔''

''اور علی میاں، انڈیا؟''

''تتی خانے میں، ماسٹر جی۔'' علی نے اپنی توتلی زبان میں 'ٹ' کو 'ت' بنا کر کہا۔

''اور محبت، سلیم میاں؟'' انھوں نے یوں گرج کر کہا کہ جیسے پوری فہرست میں سب سے سنجیدہ سوال یہی ہو۔

''منزہ کے دادا کے کھسے میں'' میرے منہ سے نکلا۔

یہ فضول جواب اگر کسی اور نے دیا ہوتا تو آدھی چھٹی ختم ہونے سے پہلے ماسٹر جی کی سزاؤں کا جلاد بشکو نائی اس کے سر پر استرا پھیر چکا ہوتا۔ مگر میرے ساتھ ماسٹر جی نے روایتی نرم دلی برتی اور بچوں کے ساتھ ہنس دیے، پھر کہنے لگے:

''سلیم میاں، اب کیا ہوا؟ سبق تو فرفر یاد ہوتا ہے۔۔۔ چلیے کوئی بات نہیں، سردار صاحب سے پوچھ کر آیئے گا کل۔''

ماسٹر جی تقسیمِ ہند کے مسافر تھے۔ ان کے والدین انہیں مرغیوں والے ڈربے میں بٹھا کر کسی دور دراز کے شہر سے ہجرت کر کے ڈیرہ غازی خان لا رہے تھے کہ خونریز فساد ہوگئے، تاہم ان کا ڈربہ کسی طرح منزل تک پہنچ گیا اور ماسٹر جی در در کی ٹھوکریں کھاتے جوان ہوگئے۔ وہ ہجرت کی داستان سناتے تو آواز بدل جاتی۔ راستے کے مظالم کا نقشہ کھینچتے تو ہم رو دیتے۔ ہمارے اسکول میں ماسٹر لگ کر آئے تو انھیں ہمارا گاؤں بہت اچھا لگا۔ یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ ابو جی نے انھیں گھر بنانے کے لیے زمین دے دی۔ اس پر مکان بنانے کا ارادہ باندھا تو گاؤں والوں نے چند ہی دنوں میں دیواریں اُسار دیں۔ جوش میں آکر منزہ کے دادا نے ٹی آر گارڈر منگوا کے چھتیں ڈلوا دیں اور یوں دیکھتے ہی دیکھتے ان کا مکان مکمل ہوگیا۔ سرکاری نوکری اور نیا مکان ہو تو شادی انسان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا ہے۔ یہی دو چیزیں دیکھ کے ساتھ والے گاؤں سے کسی نے ماسٹر جی کو لڑکی دے دی، اور مکان گھر ہوگیا۔

''بل کہ سردار صاحب سے مت پوچھیے گا، خود ڈھونڈتے رہیے۔ کبھی مل جائے تو ہمیں آ کے بتانا ضرور کہ کہاں ہے محبت!''

''جی ماسٹر جی،'' میں نے آہستہ سے کہا۔

ماسٹر جی نے ایک مرتبہ پھر سب بچوں کو ''شاباش، شاباش'' کہا اور چلے گئے۔ آدھی چھٹی کا وقت ختم ہونے کو تھا مگر وقت کے حساب سے بے نیاز سب بچے اودھم مچانے کے لیے میدان کو بھاگ گئے۔ میں قمیص کا پچھلا پلو گود میں ڈال کر وہیں زمین پہ آلتی پالتی مار کے بیٹھ گیا اور خود سے ایک وعدہ کیا۔ یہ وعدہ ایسا ہی تھا جیسا اُس وقت کے بچے کرتے تھے۔ 'کچھ بھی ہو اپنی بستی کی اس گمشدہ چیز کو ڈھونڈ لاؤں گا۔ مُجھے محبت کو ڈھونڈنا ہے۔ ماسٹر جی کی شاباش لینی ہے---'

--☆--

﴿۲﴾

میری یونی ورسٹی میں سمسٹر بریک کا آغاز ہوتے ہی طلبہ کے The Skies نامی ہاسٹل کے پچاس میں سے کوئی چالیس سے زائد رہائشی دوسری ریاستوں یا ملکوں میں چھٹیاں گزارنے چلے گئے تھے۔ کوئی MIT میں نوم چومسکی کے ساتھ تصویر کھنچوانے کے شوق میں تو کوئی لاس اینجلس میں ایما واٹسن سے ہاتھ ملانے کی خواہش میں، کوئی فلوریڈا میں ڈزنی لینڈ دیکھنے تو کوئی آئیوا میں یوگا کی ورک شاپ میں شریک ہونے۔ کوئی یورپ گھومنے تو کوئی جنوبی امریکا۔ جو بچ رہے ان میں سے چار پانچ نے تو بولڈر شہر کے مضافات میں بلند و بالا پہاڑی سلسلے Rocky Mountains پر کیمپنگ کی منصوبہ بندی کر لی اور وہ ایک دن منہ اندھیرے روانہ ہوگئے۔ فلپینی کک میڈی کو فیکٹری نما باورچی خانے سے فراغت ملی تو وہ اپنے ٹونی کے ساتھ اس قدر مشغول ہوئی کہ اسے باقی کے چھ سات لوگوں کا کھانا بنانا جیسے یاد ہی نہ رہا۔ ویسے بھی ان چھ سات لوگوں میں سے ایک اپنے بوائے فرینڈ کو بولڈر اور مضافات کے ریستورانوں سے متعارف کرانے میں مصروف تھی۔ دوسری، صبح ہوتے ہی جوگنگ کرتی تین چار میل دور اپنی ماں کے گھر پہنچ جاتی اور اس کے بقول چوں کہ اس کی ماں کا نیا خصم کام کے لیے ''دفع'' ہو چکا ہوتا ہے لہٰذا اسے وہاں کھانے پینے، نہانے دھونے اور کبھی کبھی کچھ دیر سونے کا بھی موقع مل جاتا ہے۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ The Skies میں بہت کم لوگ رہ گئے تھے۔ میڈی کے گُستے ٹونی کے علاوہ اینا اور اس کی بہترین دوست جینی بھی پیچھے رہ جانے والوں میں شامل تھیں۔

--☆--

میں کارنر روم کے انتہائی گداز صوفے پر دونوں بازو پھیلائے مخمور آنکھوں سے اسکرین پر ٹکٹکی باندھے بیٹھا تھا۔ صوفہ تو نرم و گداز سا تھا ہی مگر میرے دائیں طرف بیٹھی جینی بھی کسی طور کم نہیں تھی۔ بائیں طرف اینا جو میرے ہاتھ کو مسلسل سہلا رہی تھی، اس قدر قریب بیٹھی تھی کہ اگر آج میرے بچپن کے ماسٹر جی کہیں سے آ کر دیکھ لیتے تو میرے ساتھ تمام تر نرمیوں کے باوجود فوراً بشکو نائی کو بلوا کر مجھے گنجا کروا دیتے۔۔۔ اور اگر خود بشکو دیکھ لیتا تو یقیناً پاگل ہو جاتا، اپنے ہی سر پہ استرا پھیر لیتا۔

اگرچہ میں اپنی پسندیدہ فلم Vertical Limit کے سحر میں تھا پھر بھی اخلاقی ذمہ داری کا پاس رکھنے کے لیے وقفے وقفے سے دائیں اور بائیں ہاتھ سے دوشیزاؤں کے کندھوں کے گول گول کونوں کو ہلکے ہلکے تھپک دیتا تھا۔ فلم کے بیشتر مناظر پاکستان کے تھے جو بار بار مجھے وہیں پہنچا دیتے۔ ایک بار مروتاً میں نے اینا کے ہاتھ پر ذرا سا بوسہ دیا تو پہلے مجھے اپنا گاؤں یاد آیا۔ پھر ابو جی کے گھوڑے اور پھر اُن کی لگام۔

مجھے امریکا آئے تقریباً دس ماہ گزر چکے تھے اور میری طبیعت میں کچھ ٹھہراؤ بھی آ رہا تھا۔ ایم اے انگریزی کے دو سمسٹر ہو گئے تھے، اینا مل چکی تھی، میرے مضامین پاکستان کے انگریزی اخبار اور جرائد میں چھپنے لگے تھے اور گاڑی تو یہاں پہنچتے ساتھ ہی میں نے لے لی تھی۔ تاہم اب بھی جس کو جی بھر جانا بولتے ہیں نا وہ رَجا ہوا احساس نہیں آیا تھا۔ سو ابھی توبہ نہیں کی تھی۔ مجھے وطن کی یاد آتی تو تھی مگر ستاتی نہیں تھی۔ میرا واپس جانے کو من نہیں تھا۔ American Dream ادھورا تھا۔ میری Vertical Limit کی حد ابھی نہیں آئی تھی۔

فلم کے ایک سین میں ایک پاکستانی فوجی، بھارتیوں کو جگانے کی پدرانہ ذمہ داری نبھانے کا عہد کر کے سینہ تانے پہاڑی کے کنارے پر لگی مشین گن کی طرف گیا تو اس حُسنِ کارکردگی پر داد وصولنے کے لیے میں نے دائیں دیکھا۔ جینی میرے جوان کو دیکھنے کے بجائے سامنے میز پر رکھے اپنے گلاس کو گھور رہی تھی۔ جس میں ریڈ وائن کا ایک گھونٹ ابھی باقی تھا۔

"Hey, chin up, Jenny."

میں نے اس کے سر پر ٹھوڑی رگڑتے ہوئے کہا۔

"I can't, Saleem. I'm hurt. I'm feeling guilty..."

یہ کہتے کہتے اس نے سر میرے کندھے پر رکھ دیا۔

"You don't have to. He dumped you, you didn't dump that bastard."

اینا نے تند لہجے اور اپنی مغلظ زبان میں جینی اور ڈیو کی علیحدگی کا ذمہ دار ڈیو کو ٹھہراتے ہوئے کہا۔

جینی نے خاموشی سے آگے بڑھ کر گلاس اٹھایا اور منہ سے لگا لیا۔ لیکن اس سے مزید کچھ نہیں کہا گیا۔ آنسو اس کی آنکھوں میں یوں اُمڈ آئے جیسے ان میں ابھی شہد سے تر سلائی پھیری ہو۔ اس نے سامنے میز پر سے ٹیڈی بیئر اٹھایا اور اس کے ہاتھوں سے اپنے آنسو پونچھ لیے۔ پھر 'آئی ایم سوری' کہہ کر ٹیڈی بیئر کو سینے سے لگائے وہاں سے اٹھی اور بالائی منزل پر اپنے کمرے کو چلی گئی۔

فلم ختم ہونے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا مگر اینا تو جیسے جینی کے جانے کا ہی انتظار کر رہی تھی۔

--☆--

اینا مجھے The Skies کے ڈائننگ ہال میں یوں مل گئی تھی جیسے کسی انتہائی غریب بچے کو یک مشت سو کا نوٹ مل جائے، اور وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر اسے اچک تو لے مگر پھر یہ سوچ سوچ

کر ہلکان ہوتا رہے کہ اسے کب، کہاں اور کیسے خرچ کرے؟

اُس خوش قسمت روز، میں یونی ورسٹی سے واپس ہاسٹل آیا تو حسبِ معمول پُول ٹیبل پر گیا اور اسٹک اٹھا کر بالز کو ہولز میں ڈالنے کی مشق کرنے لگا۔ زمان اور مکان کے اُس تراشیدہ سنگم پر میرا بایاں ہاتھ ٹیبل پر سپورٹ بن کر ساکت تھا، دایاں کمر کے پیچھے سے اسٹک کو آگے پیچھے چلا رہا تھا کہ میری نظر بال سے اٹھ کر سامنے فریج پر جھکی لڑکی کی کمر پر جا ٹکی۔ یہ کمر، اس ہاسٹل میں مَیں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

وہ سیدھی ہوئی تو نظر کو جیسے وہیں گوند ہی لگ گیا۔ یہ سراپا دیکھنے سے پہلے غالب کی 'سرو قامت' والی ترکیب میرے دماغ میں کبھی نہیں آئی تھی۔ یقیناً تہذیبِ سندھ کے زمانے کے کسی فن کار نے تراشا تھا یہ بدن۔ اُس نے لانگ شوز، سیاہ اسکن ٹائٹ پتلون، اور لال رنگ کی ایک نفیس سی شرٹ پہنی ہوئی تھی جو اُس کی کمر سے یوں والہانہ لپٹی ہوئی تھی جیسے سرخ بیل تاج محل کی عقبی دیوار سے۔ اچانک میرا دایاں ہاتھ چھوٹ گیا۔ اسٹک بالز سے ٹھاک کر کے ٹکرائی، بالز ایک دوسرے سے۔۔۔ اور یہ آوازیں اُس کی سماعتوں سے۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور ''ہائے'' بول کر بے نیازی سے فریج کی طرف پلٹی؛ ایک بار پھر پیچھے دیکھا، پھر ذرا غور سے دیکھا۔۔۔ اور کسی قوتِ غیبی کے زیرِ اثر میری طرف کھنچی چلی آئی۔

"Hi, I'm Anna." اس نے پول ٹیبل کے اُس پار سے کہا۔

"Hello, I'm Saleem." میں نے شاہانہ انداز میں اسٹک بلند کر کے کہا۔

یہ اور بات کہ اسٹک اگر پول ٹیبل کے اوپر لٹکے فانوس سے ٹکرا جاتی تو منظر بدل کر 'مجنوں نظر آتی ہے، لیلیٰ نظر آتا ہے' سا ہو جاتا۔ مگر وہ دن شاید میرا تھا اور میں اس وقت کسی بالی ووڈ فلم کے گانے کی تمہید بنا خود کو اس دوشیزہ کی سنہری زلف کا اسیر بنتے دیکھ رہا تھا۔ دل پھینک مَیں بالکل نہیں تھا، مگر آج جو حسینہ میری آنکھوں کے سائے میں آ ٹھہری تھی اس کے حسن کے استعارے میں نگری نگری گھما آیا تھا۔ اس کی پیشانی کی تراش گویا کسی جدید ترین لیزر سے کی گئی

تھی۔ آنکھوں کی جگہ دو نیلے موتی جڑے ہوئے تھے۔ رخسار نہ تھے دو مقعر عدسے تھے، جن پہ میری نظر پھسل پھسل جا رہی تھی۔ اس کی ناک نفاست کا مترادف تھی اور پیشانی برف پوش پربت کی، لب لالی کے ہم معانی تھے اور کان کہانی کے۔۔۔۔ میرے سامنے میرے گاؤں کی متاعِ گم گشتہ، میرے پرائمری اسکول کی اسائنمنٹ کھڑی تھی۔

بہ خدا میں نے اسی طرح کے حسن کی تلاش میں یہاں داخلہ لیا تھا۔ ویزا لینے امریکی سفارت خانے میں ایسی ایسی چیزیں اتار کے گیا کہ جنہیں کبھی مسجد میں بھی اتارنے کا نہیں سوچا تھا۔ اپنی مٹی کا منکر بن کر پردیس روانہ ہوا۔ ثقلِ زمین سے بغاوت کر کے کوئی بیس گھنٹے ہزاروں فٹ کی بلندی پر اڑتا رہا۔ شکاگو ایئر پورٹ پر تین گھنٹے اُلو بنا بیٹھا رہا تا کہ امریکی سیکیورٹی اہلکار یہ طے کر سکیں کہ میں دہشت گرد نہیں ہوں۔ بہ ظاہر تو یہ سب کچھ علم کی پیاس بجھانے کے لیے جھیلا تھا کیوں کہ سچ نہ والدِ محترم جناب ضیاء الدین بلوچ کو بتا سکتا تھا اور نہ ہی اپنی سپر پاور امریکہ کو۔ مگر سچ یہی ہے کہ میں اس حسن کی دیوی کی تلاش میں یہاں آیا تھا۔ ویسے بھی یہ ایم اے انگریزی تو میں پہلے ہی نمل سے کر چکا تھا۔ شیکسپیئر اور مارلو، ارسطو اور ایلیٹ، ادبی نظریات اور تاریخ، جین آسٹن اور فیلڈنگ، سلویا پلیتھ اور ٹونی موریسن، ان سب کو تو میں پڑھ چکا تھا۔ اگر کچھ پڑھنا باقی تھا تو وہ ان نیلی آنکھوں کا نصاب تھا۔ اس وقت بس اسی کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ اینا ٹیبل کے اُس کنارے سے اِس تک آ ئی؛ میرے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے کر تیسری بار ''ہائے'' بولا۔

"I like the shine on your hair" اس نے رسماً کہا۔

"Thank you! Nice shirt!" میں نے سیکڑوں خوب nice چیزوں میں سے ایک کا انتخاب کر کے کہا۔

میں چند ہی دنوں میں اینا کو اسی پول ٹیبل پر لے آیا۔ یا شاید وہ مجھے وہاں لے آئی۔ اسلام آباد کے میگا زون میں سنوکر کھیلتے رہنے کی بہ دولت میں اس کھیل میں مشاق تھا۔ اینا کو اس کھیل کے اصول بتائے، اسٹک پکڑنے، سپورٹ دینے اور ہٹ کرنے کے گُر سکھائے۔ بدلے میں اینا نہ صرف

مجھے پیار دیتی بل کہ کافی میکر سے میرے کپ میں کافی بھر لاتی، اس میں براؤن شوگر ملاتی اور جب میں کافی پی رہا ہوتا، وینڈنگ مشین سے چاکلیٹ نکال لاتی۔

--☆--

خیر آج تو ہم نے پول کھیلا ہی نہیں تھا۔ میں سمسٹر کا آخری پیپر دے کر آیا اور یہ فلم دیکھنے بیٹھ گیا۔ اینا کام سے واپس آئی اور جینی کو ساتھ لے کر سیدھی کارنر روم میں آ گئی۔ جینی نے اپنی کتھا سنائی۔ اس کا بوائے فرینڈ اسے چھوڑ کر اپنی نئی گرل فرینڈ کے ساتھ لاس اینجلس جا چکا تھا سو وہ شکستہ دل تھی۔ ٹوٹے دل کبھی نہیں جڑنے پاتے۔ پھر بھی دوستوں کا من کرتا ہے کہ مداوا کریں۔ اینا نے کارنر روم کے فریج کا دروازہ کھولا۔ سامنے ریڈ وائن کی ایک بوتل پڑی تھی۔ اس نے مڑ کر مجھے آنکھ ماری اور بوتل نکال کر ٹیبل پر رکھ دی۔ پھر کیبن سے دو گلاس نکالے اور ان میں وائن اُنڈیل دی۔ کچھ سوگوارانہ توقف کے بعد اینا نے اپنا گلاس اٹھا لیا اور جینی نے اپنا۔

کئی دنوں سے اینا میرے امتحان کے ختم ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ چھٹیاں آتے ہی ہاسٹل پر سکوت طاری ہو جائے گا اور مجھے اس کے ساتھ وقت گزارنے کے لیے وہ پرائیویسی میسر آئے گی جس کا تقاضا میں ہمیشہ کرتا تھا۔ ہاسٹل کے اصولوں کے مطابق لڑکوں کو لڑکیوں کے اور لڑکیوں کو لڑکوں کے کمروں میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ سو سماجیاتی معاملات اور محبت سے ملاقات کارنر روم میں ہی ممکن تھی۔ مگر جب بھی ہم کارنر روم میں آتے یا تو وہاں پہلے سے کوئی بیٹھا ہوتا اور یا جب ہم میٹھی میٹھی باتوں کے سُر الاپنے لگتے تو سعودی بھائی خالد کو اپنا ہیڈ فون یاد آ جاتا، یا کسی چینی لڑکی کو کارنر روم سے اپنا چارجر بازیاب کرانا پڑ جاتا۔ یوں میں پاک چین دوستی کے نعرے لگانے لگتا۔ جب کہ اینا انگڑائیاں، جمائیاں اور اپنا سا منہ لے کر رہ جاتی۔ سو وہ کسی ایسے دن کی منتظر تھی جب اس کے اور میرے بیچ محبت کے علاوہ اور جان دار شے کوئی نہ

ہو۔ کولوراڈو یونی ورسٹی کی ان چھٹیوں کا بھرپور فائدہ لینے کے لیے اس نے اپنے اسٹور سے ایک ہفتے کے لیے چھٹی بھی لے لی تھی۔

آج اس کی چھٹیوں کی آٹھ میں سے پہلی رات تھی۔ جب جینی 'آئی ایم سوری' کہہ کر، اپنے گلاس میں ذرا سی وائن چھوڑ کر، اور ٹیڈی بیئر لے کر بالائی منزل پر اپنے کمرے کو چلی گئی تو اینا نے جھٹ سے ریموٹ اٹھایا اور ڈی وی ڈی کو بند کر دیا۔ ایل ای ڈی اسکرین سے پاکستان کے برفیلے پہاڑوں کا منظر ہٹا تو یک دم مجھے اینا کے جسم کی حرارت محسوس ہوئی۔ میں پہلے مسکرایا، پھر اینا کی طرف منہ کر کے صوفے پر آلتی پالتی مار کر نیلی آنکھوں کی کتاب کے صفحے اُلٹنے لگا۔ اینا کے صبر کا پیمانہ تھا کہ لبریز ہوا جا رہا تھا۔

--☆--

ربِ لامکاں کا صد شکر ہے کہ اس نے ہمیں توفیق دی کہ ہم اردو ادب کی کتب کو سافٹ میں تبدیل کر سکے۔ اسی صورت میں یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ مزید اس طرح کی عمدہ کتب حاصل کرنے کے لئے ہمارے گروپ میں شمولیت اختیار کریں۔

انتظامیہ برقی کتب

گروپ میں شمولیت کے لئے:

عبداللہ عتیق: 8848884 347 -92+

محمد ذوالقرنین حیدر: 3123050300-92+

اسکالر سدرہ طاہر صاحبہ: 0120123 334 -92+

﴿۳﴾

میرے گاؤں میں جوانی عموماً ایسے موسم میں آتی ہے جب میمنوں سے لے کر گلہریوں تک اور تیتروں سے لے کر تلہیروں تک سب اپنے اپنے ٹھکانوں سے نکل آتے ہیں اور کھلے میدانوں میں اچھل کود کر کے جوانوں کے شوقِ شکار کو شہ دیتے ہیں۔ درخت سر جھکا کر اپنی پیرانہ سالی کا خراج میٹھے پھلوں کی صورت ادا کرتے ہیں۔ یہ موسم اس قدر رنگین ہوتا ہے کہ پھولوں کی خوش رنگی دوبالا ہو جاتی ہے، بادلوں کی گھن گرج تو پست ہو کر رہ جاتی ہے، مگر برکھا کی مستی گلی گلی مچل مچل جاتی ہے۔ یہ موسم خوش بوئیں لگانے، گپیں ہانکنے اور آئینے کے سامنے بال سنوارنے کے فوراً بعد آتا ہے۔ سو اس میں گھوڑے دوڑانے اور ستاروں پر کمندیں ڈالنے کا رواج عام ہے۔ اسی موسم میں جانے کہاں سے کچھ خُوب رو سے چاند چہرے بھی نکل آتے ہیں۔ چٹھیاں آتی ہیں، بانسریاں بجتی ہیں، نقاب ڈھلکتے ہیں اور آنکھیں بولنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ یکا یک سینے میں اک دل اُگ آتا ہے اور کسی لاڈلے کی طرح شور مچانا شروع کر دیتا ہے۔ بہلن کو چندا کا تقاضا کرتا ہے۔

یہ سب وارداتیں تقریباً تمام لوگوں کے لیے قریب قریب یکساں نوعیت کی ہوتی ہیں۔ اس سے آگے کی کہانی ہر کسی کی اپنی ہوتی ہے۔ لیکن میرا معاملہ شروع ہی سے مختلف رہا۔ ایک

بانسری بجانے کے علاوہ میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ گھوڑے دوڑائے، نہ تارے توڑے۔ چٹھی آئی، نہ مُشک بار ہوا چلی۔ نقاب اڑا، نہ دل جاگا، نہ دھڑکا، نہ آنکھوں کو نائی بنا کر پیغام بھیجا۔ کچھ بھی قابلِ ذکر نہ ہوا۔ سر منڈاتے ہی اولے جو پڑے۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو ماسٹر جی کا دیا ہوا سوالِ محبت مجھ پر مسکرا رہا تھا۔ یہ سوال روحانی، رومانوی اور جسمانی تو تھا ہی مگر ساتھ ساتھ فکری بھی تھا۔ ایکشن کے موسم میں اسی ایک سوال نے نِڈھال کیے رکھا۔ میں ہر وقت اقبالی پوز بنائے فکرِ محبت میں مبتلا رہتا۔ سوچ سوچ کر خود کو نیم لُلا کر بیٹھتا تو لوگوں سے پوچھتا کہ بھائی کوئی تو بتاؤ کہ محبت کہاں ہے؟ کوئی قہقہہ لگا دیتا، کوئی شرما جاتا۔ کوئی مجھے پاگل قرار دیتا تو کوئی ڈر جاتا۔ دو چار لوگوں نے اپنی دیہاتی سوجھ بوجھ کے مطابق جواب دینے کی کوشش بھی کی مگر ان عام جوابوں سے دل قائل نہیں ہوا۔ ہوتا بھی کیسے؟ ایک صاحب نے اپنے معدے پہ ہاتھ رکھ کے کہا ''محبت ادھر ہوتی ہے، دل میں۔'' دوسرے نے کہا ''محبت صرف گدھوں کو نظر آتی ہے۔ اگر کبھی آدھی رات کو کسی گدھے کو ہنہناتے ہوئے سنو تو دوڑ کے اُس کے پاس پہنچ جاؤ، محبت وہیں کہیں مل جائے گی تمہیں۔'' ایک اور بھائی نے بہت ہی دردمندی سے مشورہ دیا ''اس کے بارے میں سوچو بھی مت۔ کیوں حرام شئے کو کھوجتے ہو؟''

سچ تو یہ ہے کہ مجھے کبھی کبھی ماسٹر جی پر غصہ بھی آتا تھا۔ اگر اتنا ہی مشکل تھا تو مجھے کیوں دیا یہ سوال؟ میرا اتنا وقت برباد کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ مجھے کیا معلوم محبت کہاں ہے؟ کبھی کبھی مجھے لگتا محبت نام کی کوئی چیز خدا نے پیدا ہی نہیں کی۔ ماسٹر جی نے جھوٹ بولا۔ مجھے تنگ کرنے کے لیے کہہ دیا کہ یہ بھی گاؤں کی ان چیزوں میں شامل ہے جو گم شدہ ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے ان کے وہ سبھی سوال ہی مضحکہ خیز لگنے لگتے۔ سکون، غیرت، نیکی؟؟ کوئی بھی ایسی چیز نہ تھی جسے دیکھا جا سکے، چھوا جا سکے۔

مگر پھر سوچتا کہ تلاش جاری رکھنے میں کیا حرج ہے۔ میری زندگی میں کوئی جستجو تو ہے۔ لایعنی سا سہی کوئی سوال تو درپیش ہے۔ خیر تلاش تو جاری بھی تھی۔ البتہ گاؤں کو چھان مارا تو

سوچا کہ اب کہیں اور جا کے دیکھنا ہوگا۔ سفرِ محبت پہ نکلنا ہوگا۔

--☆--

ہمارے گھر کا بڑا دروازہ شمال کی طرف کھلتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مغرب میں ایک قطار میں چار کمرے تھے جن کا رخ جنوب کو تھا۔ اس قطار کے چوتھے کمرے سے ملحق چار کمروں کی ایک اور قطار تھی جن کا رخ مشرق کی جانب تھا۔ کمروں کے اس "L" نما کے سامنے ایک وسیع صحن تھا۔ جس کے بیچ میں ایک باغیچہ تھا جہاں امی جی نے گلاب سے لے کر گوبھی تک سب الا بلا اگایا ہوا تھا۔ اس کے ایک کونے میں نیم کا درمیانے قد کا ایک درخت تھا جس کی کچھ موٹی موٹی شاخیں گویا سر جوڑ کے بیٹھ گئیں۔ جیسے انہیں بھی کوئی سوالِ محبت درپیش ہو۔ ان میں سے دو شاخیں زمین سے کوئی تین چار فٹ اوپر جنوب سے شمال کو عموداً جا رہی تھیں۔ سطحِ زمین کے اوپر وہ ایک دوسرے سے اس قدر قریب اور متوازی تھیں کہ شاخوں کے بجائے محبت کا پلنگ لگتیں۔ ان سے تقریباً ایک فٹ اوپر دو اور شاخیں بھی عموداً جا رہی تھیں۔ ان کی ہیئت ایسی تھی کہ مجھے وہ محبت کے دو گاؤ تکیے لگتے۔ اوپر کی شاخیں قدِ آدم کی بلندی سے شروع ہوتیں۔ مگر ان کی خم دار بناوٹ سے یوں لگتا جیسے اس جگہ کو کسی غیبی مخلوق نے کسی خاص مقصد کے لیے یوں تراشا ہے۔ میں اسے محرابِ محبت کہتا تھا۔ اور جب جب وقت ملتا پلنگ نما شاخوں پہ جا بیٹھتا۔ اردگرد کی شاخیں مجھے اپنی آغوش میں لے لیتیں اور میں آنکھیں بند کر لیتا۔ سوالِ محبت پر غور کرتا۔

--☆--

ایک روز میں میٹرک، ایف اے، بی اے کی اسناد، ڈومی سائل، چار تصدیق شدہ تصویریں اور محبت کا سوال بغل میں دبا کر شمال مشرق میں واقع حکومتوں کے شہر اسلام آباد آیا اور سید ھا نمل یونی ورسٹی میں آ کھڑا ہوا۔

علم کی کائنات میں یہ چھوٹی سی یونی ورسٹی ایک چھوٹی سی سڑک کے سہارے یوں مضبوطی سے پاؤں جمائے کھڑی تھی جیسے ہمالیہ کی کسی چھوٹی سی چوکی پر ہمارا کوئی جوان اپنے

جذبوں کا الاؤ روشن کر کے کھڑا ہو۔ اس علم گاہ کے سنتریوں نے یا تو میرے دیہاتی پن کے ادب میں یا پھر میرے جُثے سے سہم کر مجھے بغیر حساب کتاب کے اس جنت کے اندر آنے دیا۔ چھوٹے دروازے سے گزر کر کمر سیدھی ہی کی تھی کہ سامنے والی عمارت نے تقریباً میری پیشانی کا بوسہ ہی لے لیا۔ اسی عمارت میں مَیں نے اپنی زندگی کے دو سال بہلانے تھے۔ یہ عمارت جیسے مجھے دیکھ کے نہال سی ہوگئی۔ دوہری ہو ہو کے فرشی سلام کرنے لگی۔ کبھی ایک زبان میں خوش آمدید کہتی، کبھی دوسری میں۔ کبھی مقامی بولی میں، کبھی غیر ملکی بولی میں۔ اس کی ان اداؤں پر مجھ سادیہاتی مَر نہ مِٹتا تو اور کیا کرتا؟ میں نے سامان کی گٹھڑی ایک طرف رکھی، قمیص کی دائیں بائیں والی جیبوں کو شلوار میں سے نکال کر، ان میں سے فیس کے پیسے نکالے، اور ایک بہت بڑی عینک کے پیچھے بیٹھے منشی صاحب کی تلی پر دھر دیے۔

مگر یہاں کے طلبہ، یونی ورسٹی کی آؤ بھگتی طبیعت کے برعکس تھے۔ بل کہ ان کے عجیب ہی نظارے تھے۔ لڑکوں کے دل تو کیا، مونچھیں بھی نہیں اُگی تھیں اور لڑکیوں کے نقاب تو کیا دوپٹے بھی نہ تھے۔ سب بولتے ایسے چتر چتر تھے جیسے محبت سمیت سبھی سوالوں کے جواب آتے ہوں۔ چلتے ایسے تھے جیسے کبھی ان کے ماسٹر جی نے ان کو ٹنگوٹا نڑیں اٹھوایا ہی نہ ہو۔ مجھ میں اور ان میں فرق تھا۔ مجھ میں دیہات کا رچاؤ تھا، ٹھہراؤ تھا۔ ان میں شہر کا کاغذی پن تھا، تیزی تھی۔ میرا بال بال سرسوں میں تر تھا، اپنے مقام پہ، اپنے گھر تھا۔ ان کے چہروں میں بھی ہرجائی پن تھا، تغیر تھا۔ میں چلتا تو میرے ساتھ میرا دیہاتپن چلتا، اندھے کو بھی اندازہ ہو جاتا کہ دیہاتی جا رہا ہے۔ یہ چلتے تو کہیں کے نہ لگتے۔

ایک بات تو طے تھی کہ میری ان میں سے کسی سے بن نہیں پائے گی۔

تقریباً وہی ہوا۔ ایم اے انگریزی میں داخلہ ملا مگر کم از کم شروع کا کچھ عرصہ میری کسی سے کوئی بہت گاڑھی نہیں چھنی۔ چناں چہ ہر ہفتے میں چھ سات گھنٹوں کے سفر پر گاؤں جاتا۔ دوستوں سے ملتا، زمین دارے میں ابو جی کا ہاتھ بٹاتا، لوگوں کی رشک بھری نظروں کو پڑھتا۔ اب

تو خیر منزہ کے دادا بھی کچھ متاثر ہونے لگے تھے۔ نہ بھی ہوں متاثر، میرا ایسے لوگوں سے کیا لینا دینا۔ انھی سے اجتناب کرنے کے لیے میں اکثر لمبا راستہ طے کر کے گھر جاتا، کیوں کہ ان کا ڈیرہ سڑک اور ہمارے گھر کے بیچ میں تھا۔ دوسرا راستہ ندی کے ساتھ ساتھ سے ہوتا ہوا کھیتوں میں سے گزرتا تھا۔ یہ راستہ طویل تو تھا مگر سایہ دار درختوں اور کسانوں کی صحبت کی بہ دولت تھا بہت ہی تازہ دم کر دینے والا۔

پنڈی والی بس میں ساری رات کا سفر طے کر کے میں صبح صبح گاؤں کے پاس روڈ پر اترتا تو پاس کھیتوں میں کام کرنے والے کسانوں میں سے کوئی میری کتابیں اٹھا لیتا اور کوئی بیگ۔ کوئی میری جینز پہ ہنستا تو کوئی میری بدلتی ہوئی چال پہ جملہ کس دیتا۔ کوئی لسی کا گلاس بھر کے پلاتا تو کوئی بیر دھو کر کھلاتا۔ گھر پہنچتا تو امی جی شک کر بیٹھتیں کہ میں ناشتہ ڈیرہ اسماعیل خان کے کسی ہوٹل سے کر آیا ہوں۔

مجھے میرے گاؤں کی سب اچھی اور بری خبریں بھی اسی راستے پر ملتی تھیں۔

اسی راستے پر مجھے ایک قصہ گو صفت کسان نے ایک دن بشکو نائی کے حوالے سے ایک واقعہ سنایا۔ جو کچھ یوں تھا کہ ایک دن ہمارے تایا جان نے بشکو نائی کو حجامت وغیرہ بنانے کے لیے بلایا۔ بشکو نے بال بنانے کے بعد حسبِ معمول دِناشتے کا وقفہ کیا تو تایا نے حسب عادت افیون کی گولی کھائی اور شیو بنوانے کے لیے تکیے کی ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ بشکو نے ان کے گالوں پر پانی اور صابن لگا کر سہلایا تو تایا جان خراٹے لینے لگے۔ یہاں تک تو سب کچھ نارمل اور معمول کے عین مطابق تھا مگر اس کے بعد جو کچھ ہوا اس پر تایا جان تو کیا پورا گاؤں غصے میں تھا کہ نائی ذات کی یہ جرأت۔ ہوا کچھ یوں کہ جب تایا جان افیون اور تکیے کے آسرے سو گئے تو بشکو نائی کو اپنی بیوی کی یاد آئی اور ساتھ ہی اس کے سینے میں انتقام کی آگ جاگ گئی۔ سو اس نے نہ صرف ان کی داڑھی کی شیو بنائی بل کہ ان کی مونچھیں بھی مُونڈ ڈالیں اور اسی اُسترے ہی سے سر کو بھی روڈا کر ڈالا اور وہاں سے نکل لیا۔ تایا جان نے آدھی نیند میں منہ پر ہاتھ پھیرا تو پہلے تو کچھ دیر یہ سمجھتے رہے کہ بشکو ان کی

جگہ کسی اور کو وہاں دُھا گیا ہے۔ مگر جب مکمل جاگے تو غصے سے ایسے چنگھاڑے کہ ان کی رعب والی آواز لوگوں نے ساتویں گاؤں تک سنی۔

وہ بہ ضد تھے کہ ابھی جا کر بشکو کے سینے میں چار نمبر کارتوس اتاریں گے۔ لوگوں نے انھیں پکڑ رکھا تھا کہ یہ اگر وہاں چلے گئے تو نائیوں کا محلّہ ہی صفحۂ ہستی سے مٹا آئیں گے۔ کیوں کہ ان کی پیٹی میں، جو انھوں نے کمر کے ساتھ لٹکالی تھی، کوئی پچاس کارتوس اٹکے ہوئے تھے۔ گاؤں والوں نے پانی وانی پلا کر ٹھنڈ مُنڈ تایا جان کو بٹھایا ہی تھا کہ نائی خود بشکو کو گردن سے پکڑ کر ان کے دربار میں لے آئے کہ تایا جان جو سزا چاہیں دے دیں۔

مگر تایا جان کی باری کس بے غیرت نے آنے دینی تھی۔

سب لوگ تو پہلے ہی غضب کھائے کھڑے تھے۔ بشکو سامنے آیا تو اس پر یوں ٹوٹ پڑے جیسے نائیوں کے محلے سے بشکو کو نہیں، بل کہ منیٰ کے میدان سے شیطان کو لایا گیا ہو۔ کیا چھوٹے کیا بڑے، سب نے اپنی اپنی بھڑاس نکالی۔ کسی نے ٹھڈا مارا، کسی نے تھپڑ، کسی نے لاٹھی۔ غیوروں کا ہجوم بڑھا تو کسی سیانے کو بانی پاکستان کے ایک فرمان میں سے 'تنظیم' یاد آیا۔ فوراً کہا ''ایک ایک کر کے ترتیب سے آؤ۔'' بشکو کی رسمِ چھترول کے لیے گاؤں والوں نے قطار بنالی۔ فائدہ اس قطار کا یہ ہوا کہ کچھ نوجوان جو پہلے خالی ہاتھ تھے، قطار میں اپنی جگہوں پر صافہ وغیرہ چھوڑ کر قرب و جوار سے ہتھیار اٹھا لائے۔ کوئی کالک لایا تو کوئی قینچی تو کوئی ڈنڈا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بشکو کو تایا جان جتنا روڈا کر ڈالا اور مولوی امان اللہ جتنا سُجا دیا۔ پھر اس سے پہلے کہ بشکو دم دے بیٹھتا کسی سیانے نے اس کے گلے میں جوتوں کا ہار ڈالا اور ایک گدھے پر بٹھا کر گاؤں کا چکر لگوانے کے بہانے وہاں سے نکال لے گیا۔

اسی راستے پر دو مہینے بعد مجھے بتایا گیا کہ ایک دن بشکو نے ایک نوجوان کی حجامت بناتے بناتے استرا پھینکا اور اچانک ناچنا شروع کر دیا اور یہ کہ اب وہ ہمارے علاقے سے دُور ڈی جی خان کے اُس پار سخی سرور کے مزار پر جا بیٹھا ہے اور کبھی اس طرف کو آئے تو خوب دھمال

رچا تا ہے اور پاگلوں کی طرح کبھی محی الدین کہتا ہے، کبھی مولبی امان اللہ اور کبھی اپنی سابقہ بیوی کا
نام: 'شادی، شادی' پکارتا ہے۔

--☆--

ایک بار علی الصبح میں گاؤں لوٹا تو اپنے راستے میں ندی کنارے کھڑے پیڑوں میں کچھ
چڑیوں کو اترتے دیکھا۔ نیلے رنگ کی یہ چڑیاں اجنبی اجنبی سی تھیں یقیناً کہیں بہت دور سے آئی
تھیں۔ ان میں سے دو باقیوں سے بے نیاز ہو کر چوگ کرنے لگیں۔ ایک دوسرے کے منہ میں
دانہ ڈالتیں اور ایک دوسرے کے سر کے ننھے ننھے پروں کو پھلورتیں، ایک دوسرے کی آنکھوں میں
جھانکتیں، محبت کی کسی میٹھی بولی میں اقرارِ محبت اور عہدِ وفا کرتیں، اور اس عمل میں ان کے نیلے نیلے
پَر اس قدر چمکنے لگتے کہ حسن کی سب تصویروں کو مات دے جاتے۔ مجھے لگا کہ محبت دور دیس کی
شے ہے، اس کا روپ بدیسی ہے، رنگ نیلا ہے اور زبان لمس کی ہے، اور اس کی انتہا حسن و جمال کا
عروج ہے۔

''نیل گگن سے بھی پرے، سیاں جی کا نام!''

پہلی بار میں نے محبت نامی جنس کی ایک جھلک دیکھی اور مسکراتا ہوا گھر چلا گیا۔

--☆--

﴿۴﴾

میں آج اپنے گاؤں سے تقریباً دس ہزار میل دور اینا کی نیلی آنکھوں میں محبت کا پنچھی بن کر
اتر چکا تھا۔ عقبی دیوار میں شیشے کی ایک کھڑکی سے پردہ ہٹا ہوا تھا۔ کارزروم کے پیچھے بیس بال کے
گراؤنڈ کی فلڈ لائٹس جل رہی تھیں۔ میدان کی باؤنڈری پر لگے درخت تیز ہوا سے ماتھا ماری کر
رہے تھے۔ یہ تلاش محبت کے اگلے زینے پر قدم رکھنے کا یادگار لمحہ تھا۔

اینا خوش تھی اور زیرِ لب کچھ گنگنا رہی تھی۔

اس کی سکون آور آواز کے ترنم نے بالآخر مجھے وادیٔ خواب کی ایک سندر سی جھیل میں
پہنچا دیا، اور میں اس میں تیرنے لگا۔۔۔

--☆--

صبح سویرے کا وقت تھا۔ میری امی جی اور منزہ کی امی ہمارے ابوؤں کے گلے شکوے
کرتی ہوئی آگے آگے جا رہی تھیں اور میں اور منزہ ان کے پیچھے پیچھے۔ گاؤں کے پاس ہی مشرق
میں بابا سائیں کا کیکر تھا۔ جہاں گاؤں کی تمام عورتیں سال میں ایک دو بار ضرور آتی تھیں اور اس کا

سایہ لے کر، کوئی مَنت وغیرہ مان جاتیں۔ ایک دعا پوری ہوتی تو دو چار اور دھاگے باندھ دیتیں۔ انہی منتوں کا اثر تھا کہ مجھ سمیت گاؤں کے سبھی لڑکے سر کے بل پیدا ہو گئے تھے۔

سامنے سے اُبھرتا ہُوا سورج ہماری ننھی ننھی آنکھوں کے لیے بہت تیکھا ہوتا جا رہا تھا۔ میں اس کی طرف انگلی کا اشارہ کر کے منزہ کو بتا رہا تھا کہ 'دیکھو سورج کتنا لال ہو رہا ہے، تمہاری امی جی کے دوپٹے کی طرح اور کتنا قریب بھی۔' منزہ نے اسے غور سے دیکھا اور ہمیشہ کی طرح مجھے متاثر کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا ''میں ایک گھنٹے میں اس سورج تک پہنچ سکتی ہوں۔''

میں منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگا۔ (اُن دنوں میرے دو تین دانت چُوہا لے گیا تھا)۔ وہ اب بھی سورج کی طرف ہاتھ بڑھا بڑھا کر کہے جا رہی تھی کہ اسے زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے لگیں گے وہاں تک پہنچنے میں۔ اچانک اسے زور کی چھینک آئی، پھر آئی، تیسری بار آئی اور اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ میں نے منہ سے ہٹا کر ہاتھ جیب میں ڈالا اور اپنا خوب صورت رومال نکال کر منزہ کو دیا۔ وہ شرمائی اور اپنے چھوٹے سے ہاتھ کے اشارے سے میرے رومال کو واپس لوٹا دیا۔ اب میں اتنا بھی بچہ نہیں تھا کہ یہ نہ سمجھ پاتا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔ ظاہر ہے رومال کو اپنے چہرے سے مَس کر کے واپس مجھے دینا ایسے تھا کہ جیسے وہ مجھے اپنے چہرے کا کوئی گوشہ تھما رہی ہو جسے مَیں جب چاہتا چُوم لیتا، آنکھوں سے لگا لیتا، دل پر پھیلا کر لیٹا رہتا اور منزہ اتنی بھی عام نہیں تھی۔۔۔ پھر ان رومالوں پر نقش یادیں تب عہد و پیمان گردانی جاتی تھیں۔ رومال کی حفاظت کرنی پڑتی تھی۔ کوئی لڑکا کسی دوسرے کا رومال ہتھیانے کی کوشش کرتا تو طبلِ جنگ بج جاتا اور رومالوں کے دیوانے لہولہان ہو جاتے تھے۔

--☆--

﴿۵﴾

میری آنکھوں کو سورج کی روشنی چندھیا رہی تھی۔ کچھ دیر تک تو مجھے سائیں بابا کا کیکر ہی نظر آتا رہا لیکن غور کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ باسکٹ بال کے گراؤنڈ کا کوئی درخت تھا۔ پھر دھیرے دھیرے مجھے میری شب خیزی اور اس میں سرزد ہونے والی وارداتیں یاد آنے لگیں۔ "Vertical Limit"، دل شکستہ جینی، تیز ہوا، بارش اور بے باک اینا۔

یہ اینا کہاں چلی گئی ہے؟

میں نے اونچی آواز اور اُردو زبان میں سوچا۔ اس کے برقی وجود کو دیکھنے کے لیے موبائل اٹھا کر دیکھا۔ پیغامات والے گوشے میں گیا مگر اینا نے کوئی میسج نہیں چھوڑا تھا۔ مایوس ہو کے میں اُٹھا، سُستی سے جمائی لی۔ جوتے ڈھونڈ کر پہنے اور اپنے کمرے کی طرف چلا آیا۔

اپنے کمرے میں جا کر غسل وغیرہ کیا۔ میلے کپڑوں کی ایک ٹوکری بھر کر واشر میں ڈال آیا۔ کافی میکر سے ایک کپ کافی بنائی اور ٹوسٹر سے دو سلائس گرم کر کے ان پر شہد لگایا اور واپس کمرے میں آ گیا۔ بے خیالی سی میں یہ مختصر سا ناشتہ کیا اور برتن واپس باورچی خانے میں رکھ آیا۔ پھر ہاتھوں اور پاؤں کے ناخن کاٹے، ناک کے بال چُنے، جوتوں کے تین جوڑوں کو پالش

کیا۔اب بھی مجھ پر ایک خاص سطح کی غیر حاضر دماغی طاری تھی۔اسی کیفیت میں کپڑے واشر سے نکال کر ڈرائیر میں ڈال آیا۔اسٹور سے ویکیوم کلینز لا کے تادیر کمرے کے قالین پر رگڑتا رہا۔کلینز کے شور سے مجھے اتحاد ایئر ویز کا وہ جہاز یاد آیا جو تقریباً دس ماہ قبل مجھے ابوظہبی سے شکاگو لایا تھا اور یوں میرا دماغ پاکستان اور امریکا کے بیچ میں شٹل کاک بن گیا۔کبھی ناراض پھوپھی یاد آ جاتیں تو کبھی کنجوس ماموں،کبھی عید یاد آتی تو کبھی کسی کی شادی اور بیچوں بیچ گذشتہ رات کی بارش۔

یہ اینا کہاں رہ گئی ہے؟

کوئی اَن گنتویں مرتبہ میں نے موبائل کو منت کے انداز میں سہلایا کہ قاصدا کوئی تو خبر لا۔مگر اب بھی اینا کا کوئی پیغام نہ پا کر میں نے لیپ ٹاپ اٹھایا اور کارنر روم کی گول میز پر جا بیٹھا تا کہ فیس بک ہی دیکھ لوں۔'وہ شاید اپنے روم میں جا کر سو گئی ہے۔' دماغ نے میرے تجسس کو تھپکاتے ہوئے کہا۔فیس بک پر میں گوگل کی سی تیزی سے اینا کی پروفائل پر گیا۔

"On my way to Royal Swimmers."

اوہ،تو اینا کی چھٹیوں میں یہ سرگرمی بھی شامل تھی۔یاد آیا کہ میں نے خود ہی اینا کو کسی تحقیقی آرٹیکل کے حوالے سے بتایا تھا کہ تیراکی عورتوں کی صحت کے لیے بہت مفید ہوتی ہے۔سو یہ تو ہمارے مستقبل کے خاندان کے لیے اچھا ہی ہے۔۔۔

اینا کی طرف سے کچھ اطمینان ہوا تو مجھے یاد آیا کہ میں نے کچھ تحقیقی اور تخلیقی تحریریں مختلف رسائل میں چھپنے کے لیے بھیجی ہوئی ہیں۔بس شرفِ قبولیت کی آس لے کر میں نے ای میلیں دیکھنا شروع کر دیں۔دو تین فضول ای میلوں کے بعد میری نظر ایک کام کی میل پر پڑی۔یہ میری ایک کہانی کے حوالے سے بہت ہی معذرت خواہانہ نوٹ تھا۔نیویارک سے چھپنے والے ایک ادبی رسالے کے ایڈیٹر نے لکھا تھا ''آپ کی کہانی بہت دل چسپ ہے۔زبان،اسلوب،پلاٹ، سب کمال کے ہیں۔کردار نگاری بھی ٹھیک ہے۔سوائے آپ کے مرکزی کردار ''منزہ'' کے جو مجھے غیر حقیقی لگا ہے،اس لڑکی کا پس منظر،اس کے رویوں اور فیصلوں سے مطابقت نہیں رکھتا۔

اس لیے مجھے خدشہ ہے کہ یہ کہانی ہمارے قارئین کو سمجھ نہیں آئے گی کیوں کہ ہمارا قاری حقیقت نگاری کو پڑھنے کا عادی ہے۔ میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ اس خوب صورت کہانی کو کسی Fantasy Journal میں بھیجیں،وہ یقیناً جگہ دیں گے۔''

ڈُرفٹے منہ کا انگریزی ترجمہ بڑبڑا کر میں اگلی ای میل کو دیکھنے لگا اور سوچنے لگا کہ اس حقیقت پسند ایڈیٹر کو میں کیسے سمجھاؤں کہ میری کہانی کی منزہ کے رویے دس ہزار میلوں اور سات سمندروں کے فاصلے پر اُس مٹی سے پھوٹے ہیں جہاں حقیقت کا ایک ہی مترادف ہے اور اسے وفا کہتے ہیں۔وفا میں فنا ہوتے ہیں تو لوگ حقیقی بقا کا گوشوارہ بھرنے کے اہل ٹھہرتے ہیں۔ان رویوں اور فیصلوں کو امریکا کی مادیت پرست اکائی سے ماپیں گے تو واقعی Fantasy لگے گی۔

تھوڑی دیر بعد کچھ ای میلز وغیرہ سے ہو ہُوا کر میں واپس فیس بک پر جا پہنچا۔

"Can't wait to swim with the handsome guy from India."

میری نیوز فیڈ پر اینا کا سٹیٹس امریکی حقیقت پسندی کا منہ چڑا رہا تھا۔اینا ایک ہندوستانی کے ساتھ تیراکی کرنے والی تھی۔

میرا دل بیٹھ سا گیا۔میں نے لیپ ٹاپ بند کیا اور اپنے کمرے میں آ کر کتابوں کے ٹائٹل دیکھنے لگا۔تیسرے چوتھے نمبر پر مجھے جے ایم کوٹزی کا ناول Disgrace نظر آیا۔اسے اٹھا کر جھاڑا اور واپس کارنر روم میں آ کر پڑھنے بیٹھ گیا مگر دل نہ بہلا۔ناول میں میرا جی نہیں لگ رہا تھا۔سو کچھ دیر بعد میں وہاں سے اٹھا اور جا کر ڈرائیر سے کپڑے نکال لایا۔انہیں الماری میں لگے ہینگروں پہ لٹکایا اور ڈائننگ ہال میں آ گیا۔وینڈنگ مشین میں ایک ڈالر ڈالا اور دو چاکلیٹس نکالیں۔جب سے اینا سے دوستی ہوئی تھی،پہلی بار۔ایک چاکلیٹ کھا کر پول ٹیبل پر گیا اور وائلڈ شاٹس مارنے لگا۔اسی دوران میں اینا کی دوست جینی آئی، مجھے ''ہائے'' بولا۔فریج سے ایک پلیٹ نکال کر اَوّن میں رکھی اور وقت گزاری کے لیے میرے وائلڈ شاٹس کو دیکھنے لگی۔جوں ہی اَوّن کی سیٹی بجی،جینی اس کی طرف چلی گئی اور اپنی پلیٹ نکال کر ایک میز پر جا بیٹھی۔میں وائلڈ

شاٹس کھیلتا رہا۔ کبھی لیٹ کر کبھی بیٹھ کر، شعبدہ بازوں کی طرح، پول میں مہارت کی مشق کرتا رہا یا شاید اپنی بے چینی کو علاجتا رہا۔ پھر جینی اٹھ کر کچن میں گئی اور سینی ٹائزر چلا کر پلیٹ دھوئی۔ سینی ٹائزر کا شور میرے سر پر بھاری پتھروں کی طرح پڑتا رہا۔ وہ بند ہوا تو جینی کچن سے نمودار ہوئی۔ اس نے پلیٹ کو لا کر ڈائننگ ہال کے ڈش کیبن میں رکھا تو میرا من چاہا کہ وہ سیدھی میرے پاس آئے اور اپنے دھیمے لہجے میں میٹھی میٹھی باتیں کرے مگر وہ وہیں سے

"Have a good day, Saleem."

کہہ کر روانہ ہوگئی۔ میں نے ہلکے سے سر ہلایا اور زور سے اسٹک کو بال پر پٹخا۔

میرا لیپ ٹاپ ابھی تک وہیں کارنر روم میں پڑا تھا۔ پول اسٹک کو چھوڑ کر میں وہاں گیا۔ وہاں پھر جینی سے ملاقات ہوگئی۔ رات والے گلاس دھو رہی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور میں اسے مسکراتے دیکھ کر مسکرایا۔ اس نے ایک گلاس کو دوسرے کے اندر رکھا اور گیلے ہاتھ کا پانی مجھ پر اڑا کر "See You" کہا اور کارنر روم سے باہر چلی گئی۔ جینی کو داد دینا تو بنتی تھی۔ اس قدر تیزی سے بخارِ محبت سے صحت یاب ہونے پر۔ فیس بک کو disconnect کرنے کے لیے میں نے لیپ ٹاپ کھولا تو میری آنکھیں پھٹ سی گئیں۔ اینا نے اُس انڈین لڑکے کے ساتھ سوئمنگ سوٹ میں ایک انتہائی واہیات سیلفی اپ لوڈ کی تھی۔ کیپشن تھا:

"With Yash, the hottest guy."

سبحان اللہ۔

حقیقت پسندی۔

--☆--

میرے گاؤں کے اسکول کی گندی لیٹرین جس کے باہر کسی نے بہت بڑا بڑا INDIA لکھ دیا تھا، ہمیشہ مچھروں سے پُر ہوتی تھی۔ اس کے اندر کوئی شریف بچہ تو جانے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ میں تو اس سے دو میل دور سے بھی گزرتا تو منہ پر دو رومال رکھ لیتا تھا۔ البتہ کچھ

شرارتی بچے کبھی کبھی اس انڈیا میں جا کر مچھر مار مقابلے کی پریکٹس کرتے تھے۔ مچھر مار ٹورنامنٹ ماسٹر جی برسات کے موسم میں کراتے تھے۔ اُن خاص بچوں کو چُنتے جن کو سزا دینا لازم ہوتی اور انھیں آدھ گھنٹے کے لیے اندر بھیجتے اور زیادہ سے زیادہ انڈینز یعنی مچھروں کو مارنے کا حکم دیتے۔ جو سب سے زیادہ مارتا اسے کمانڈر کا خطاب ملتا۔ پانچویں جماعت کے کمانڈر نثار کا دعویٰ تھا کہ اس نے ایک ایک تالی میں دس دس انڈینز کو جہنم رسید کیا اور سبھی کا صفایا کر ڈالا۔

یہ منحوس یَش کہاں سے نکل آیا تھا؟

--☆--

مجھے کارنر روم میں بیٹھے ہوئے کافی دیر ہوگئی تھی۔ یہ کمرہ مشترک سی جگہ تھی جس میں ایک طرف ایک چھوٹا سا کچن تھا، دوسری طرف دیوار پر ایک بہت بڑی ایل ای ڈی اسکرین لگی ہوئی تھی۔ جس کے دائیں طرف وہ دروازہ تھا جو ہاسٹل کی طرف اس راہ داری میں کھلتا تھا جس میں دوسرے ہی نمبر پر میرا کمرہ تھا۔ اس اسکرین کے بائیں طرف ایک چھوٹی سی میز پر ایک کمپیوٹر اور ایک پرنٹر پڑا ہوا تھا۔ اس سے آگے والی دیوار میں ایک کھڑکی تھی اور ایک دروازہ؛ دونوں ہی سامنے بیس بال کے گراؤنڈ میں کھلتے تھے۔ ایل ای ڈی کے سامنے وہ نرم وگداز صوفہ تھا۔۔۔ اس کے سامنے ایک چھوٹی سی میز پڑی تھی۔ بیس بال گراؤنڈ کی طرف والی دیوار کے آگے ایک گول میز پڑی تھی جس کے اردگرد چار کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ کارنر روم کی دوسری کھڑکی کچنٹ اور فریج کے درمیان میں تھی جو ہاسٹل کے مین دروازے کے سامنے والی سڑک پر کھلتی تھی۔ چاروں دیواریں پینٹنگز سے سجی ہوئی تھیں۔

دن ڈھل چلا تھا اور میں اینا کے انتظار میں بیٹھا انہی پینٹنگز میں سے ایک کو گھور رہا تھا۔

وہ واپس آئی تو کارنر روم کے صوفے پر میرے پاس آ بیٹھی۔

"I've joined a swimming club."

اس نے خوش ہو کے بتایا۔

"Good for you."

میں نے بہ ظاہر امریکی بے نیازی سے کہا۔

"Also made friends with a handsome Indian guy."

یہ سن کر میں نے لاشعوری طور پہ ہاتھ بڑھا کر ایک ٹشو اٹھایا اور اپنی ناک پر رکھا۔

"Flue or something?"

اینا نے حیران ہو کر پوچھا۔

"No, no, I'm fine. I'm fine."

میں نے ٹشو منہ سے ہٹاتے ہوئے کہا اور اسے گوہڑی ور گا لپیٹ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔

اینا کے دماغ میں کوئی احساس آیا اور وہ ایک جھٹکے سے آگے ہو کر میرے بہت قریب آ گئی۔ اپنا سر میرے کندھے پر رکھا اور آہستہ سے کہا:

"I love you, Saleem."

میں اب بھی ٹی وی پر نظر ٹکائے بیٹھا تھا۔ اسے کیسے سمجھاتا کہ یہ محبت نہیں ہے۔

--☆--

ابو جی کو مال مویشی، اور چرند پرند پالنے کا بہت شوق تھا۔ ان کے اس شوق کا کچھ حصہ مجھے بھی ورثے میں ملا۔ میں بھی کبھی کوئی طوطے رکھ لیتا، کبھی لقے تو کبھی مرغیاں۔ دسویں جماعت میں میرے پاس کچھ اور چیزوں کے علاوہ ایک مرغی بھی تھی، جس کے سات چوزے تھے۔ ان میں سے ایک سنہری تھا اور باقی سب کے سب پیلے۔ سنہری چوزہ میرا پسندیدہ تھا۔ ایک دن میں صحن میں پڑی ایک چار پائی پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا کہ مرغی اپنے شہزادوں کو لے کر نیچے چار پائی کی پائینتی

کی طرف آ کھڑی ہوئی۔ بچوں کی ایک پہر کی بھوک بھی ماں کو بھکارن بنا سکتی ہے۔ مرغی مجھ سے دانہ مانگنے لگی۔ سارے چوزے بھی فریاد کرنے لگے۔ مگر میرا سنہری ان سب سے ایک قدم پیچھے اکڑ کر کھڑا رہا؛ کچھ بھی نہ کہا۔ میں نے روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بنا کر ان کے آگے ڈالے تو بھی وہ آگے نہ آیا۔ میری چار پائی سے نیچے گرتا دانہ نہ چُگا۔ حتیٰ کہ اس کی ماں آگے آئی اور دانہ نما ٹکڑوں پہ چونچ مار مار کر اس کے آگے ڈالتی گئی۔ پہلے ہی دانے کو کھانے کے لیے وہ جھکا تھا کہ ایک چیل آئی اور پلک جھپکتے میں اسے اچک لے گئی۔ بے بسی سے میرا دل ڈوب سا گیا۔ میں ابھی جاتی ہوئی چیل کو بے بسی سے دیکھ رہا تھا کہ دفعتہً مرغی نے ہوا میں اڑان بھری اور بجلی کی سی تیزی سے لپک کر سامنے والے کوٹھے کی چھت کے اوپر ہی اس الو کی پٹھی کو جا لیا اور اسے اس زور سے پنجہ مارا کہ چوزا اس کی گرفت سے نکل کر چھت پر گر گیا۔ مگر مرغی بجلی والے کھمبے کے اوپر تک چیل کے پیچھے گئی اور اس کی پشت پر ایک بار پھر چوٹ لگائی۔ میں دوڑ کر ایک دیوار کی مدد سے کمرے کی چھت پر گیا اور اپنے پیارے چوزے کو اٹھا لایا۔ نیچے چار پائی پر لا کر اسے پانی پلا رہا تھا کہ مرغی غصے میں کٹاک کٹاک کرتی گھر کے بڑے دروازے سے واپس آ گئی۔ اپنی فطرت کے خلاف وہ پہلی بار اتنا اونچا اڑی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ اس کا پارہ چڑھا ہوا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میرے ہاتھ میں اپنے چوزے کو دیکھ کر خوش ہوتی مگر وہ چار پائی پر آئی اور زور سے میرے ہاتھ پر پنجہ مار کر اسے چھڑا کے لے گئی۔

وہ محبت بانٹنے کی قائل نہیں تھی۔

--☆--

﴿۶﴾

میری اور اینا کی چھٹیوں کی دوسری شب بھی قریب قریب ویسی ہی گزری جیسی کہ پہلی: کارنر روم، مونگیا رنگ کا گداز صوفہ، جینی کی مختصر موجودگی اور رات گئے تک اینا سے ڈھیروں باتیں۔ صبح کے وقت میری آنکھ کھلی تو موبائل پر تین پیغامات موصول ہوئے تھے:

Anna wrote: "Love you!"

Jenny wrote: "Good morning, Saleem."

Anna wrote: "Going swimming. See ya!"

میرا موڈ پھر خراب ہو گیا۔ اور تمام صبح اور دوپہر میں یہی کیفیت رہی۔ حالاں کہ آج اینا نے پیشگی احتیاطی تدابیر بھی کیں۔ اقرارِ محبت بھی کیا اور اہتمامِ خبر بھی۔ سہ پہر کے وقت میں اپنے کمرے سے پالو کوئلو کی نئی کتاب Adultery لے کر کارنر روم میں جا بیٹھا۔ یہ ایک عورت کی کہانی تھی۔ عورت جس کی کہانی حوا سے لے کر اینا تک کروڑوں قصہ گوؤں نے بیان کی۔ جس کی ادا ادا پر انگ انگ پر کہانی کاروں نے کہانیاں کہیں۔ قلم کار کم پڑ گئے، لفظ کھپ گئے مگر اس ذات کی کہانی ہے کہ آج بھی تشنہ ہے۔ اس کے حسن اور حقیقت سے انصاف نہیں کیا جا سکا نہ اس کے بدن کی زرخیزی کو سراہا جا سکا ہے اور نہ ہی اس کے ذہن کی تیزی کو۔

Adultery ایک ایسی شادی شدہ عورت کی کہانی تھی جو سوئٹزرلینڈ جیسے ملک میں اپنے خاوند اور بچوں کے ساتھ ایک انتہائی رشک آمیز زندگی گزار رہی ہوتی ہے کہ اچانک وسطِ عمر میں اس کے اسکول کے دنوں کا دوست لوٹ آتا ہے۔ اور اسکول کے دوست تو اگر لحد کے سرہانے بھی ملیں تو انسان کا جی سب کچھ بھول بھال کر ان کے ساتھ دوڑ پڑنے کو کرتا ہے۔

تیس بتیس برس کی ہیروئن کی مہم جُو طبیعت سوئٹزرلینڈ کے پُرتعیش معمولات سے اکتا چکی ہوتی ہے، وہ اپنے اسکول کے دوست کے ساتھ انوکھے چلبلے تجربے کرنے کی ٹھان لیتی ہے۔ کچھ عرصے کے لیے دل کے پنچھی کو آزاد چھوڑتی ہے۔ اس کی رگوں میں تازہ خون دوڑنے لگتا ہے۔ اس دوران کئی بار وہ پَروا اور پرواز کے بیچ میں ڈول ڈول جاتی ہے۔ مسرت و ملامت کی کشمکش میں اس کی نیندیں بے خواب ہونے لگتی ہیں، جب کہ اس کے اُجالوں پر سہانے سہانے خواب اتر آتے ہیں۔ Adultery ایک ایسا ناول ہے جس کی کہانی آگے بڑھتی ہے تو قاری کا اعتماد متاثر ہوتا ہے۔ قاری اگر عورت ہو تو اعتماد دوبالا ہوتا جاتا ہے اور اگر مرد ہو تو لرزاں؛ جیسے کہ ابھی میرا ہو رہا تھا۔

مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی محبت کو بانٹنے پر بلا شرط آمادہ ہو جائے۔ محبت کی کوئی بھی خالص شکل اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اینا کا انڈین لڑکے کے ساتھ تیرنا اس محبت کو بانٹنے کے مترادف تھا جو میری تھی۔ خیر یہ سب کتابی معلومات پر مبنی میری قیاس آرائیاں تھیں ورنہ میں نے تو خود محبت کی شکل ہی پہلی بار اینا کی نیلی آنکھوں میں دیکھی تھی۔

--☆--

شام کے وقت میں کچن میں گیا اور فلپینی باورچی میڈی کو روٹی بنانا سکھانے لگا۔ آٹا گوندھا، اس کو نرم رکھنے کے لیے تھوڑا سا دودھ ملایا، خستہ بنانے کے لیے ایک انڈہ ڈالا، خمیر ڈالا اور اوون میں بیک کیا۔ روٹی پک گئی تو نکال کر ذرا ٹھنڈا کیا، اس میں سے ایک نوالا توڑ کر اس پر شہد لگایا اور اپنے ہاتھوں سے میڈی کو کھلایا۔ پچاس برس کی میڈی اٹھارہ برس کی معصوم لڑکی کی

طرح شرمائی بھی اور تشکر آمیز نگاہ سے مسکرائی بھی۔ اس سے میرا رشتہ مسافرت کے علاوہ غریب ملکوں کی قومیت کا بھی تھا۔ وہ پچھلی ایک دہائی سے امریکا میں مشقت کر کے فلپائن میں موجود اپنے خاندان کے مستقبل کے خدوخال سنوارنے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ حال کی اسے کوئی خاص فکر نہیں تھی۔ اس کا خاوند اسی شہر بولڈر کے مضافات میں ایک زرعی فارم پر کام کرتا تھا اور ہفتہ وار چھٹی میڈی کے ساتھ دا اسکائیز ہاسٹل میں گزارتا۔ میڈی اور اس کے خاوند کے والدین فلپائن میں میڈی کے آبائی گاؤں میں مچھلیاں پکڑ کر گزر اوقات کرتے۔ میڈی نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے چار بچے ہیں جنہیں وہ امریکہ میں رکھنا افورڈ نہیں کرتی تھی لہٰذا وہ انہیں گاؤں کے اوباش ماحول میں چھوڑنے پر مجبور تھی۔ پھر بھلا ہو آس کی دیوی کا کہ جس نے منیلا میں اس کے رشتہ داروں کو امریکی ویزا کی امید پر لگا دیا۔ یوں اس نے مستقبل کی امریکی مہمان نوازی کے بدلے اپنے بچوں کو ان کے سر تھوپ دیا۔ تاہم چاروں بچوں کو ایک خاندان کے حوالے کرنا بھی زیادتی تھی۔ لہٰذا اس نے اپنے بیٹوں بیٹیوں کو اپنے مختلف رشتہ داروں میں یوں بانٹ دیا جیسے پاکستان کی حکومت نے اپنے اسکولوں، مدرسوں اور یونی ورسٹیوں کو مختلف 'رشتہ دار' ممالک کے حوالے کیا ہوا ہے۔

جینی مارکیٹ سے ہو کر آئی اور سیدھی کچن میں ہماری طرف چلی آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک طوطا نما پرندہ تھا، جس کا تعارف اس نے اپنے نئے دوست ''ساسا'' کے طور پر کرایا۔ مجھے دل ہی دل میں جینی پر ترس آیا مگر وہ ساسا کے ساتھ اس قدر بہل گئی تھی کہ مجھے اس پرندے پر پیار آنے لگا۔ 'شکریہ ساسا' میں نے خاموشی سے کہا۔

کیا محبت محض دل بہلانے کا نام تھا؟ کیا دھیان بٹنے سے محبت کی طلب ختم ہو سکتی تھی؟ کیا ساسا جیسا نفیس پرندہ جینی کے آنسوؤں کے سیلاب کے آگے بند باندھ سکتا تھا؟ جینی کے عکسِ ماضی سے ڈیو کی یادوں کو چُگ سکتا ہے؟ کیا ایسا تو نہیں کہ کچھ لوگ اپنی محبت کی شدید طلب کا اظہار ہی ایسے کسی بہانے سے کرتے ہوں؟ کیوں کہ ٹیڈی بیئر کے ہاتھوں سے اپنے آنسو پونچھ

کر، ساسا سے باتیں کر کے احساسِ تنہائی کو کم تو کیا جا سکتا ہے مگر ختم نہیں کیا جا سکتا۔ میں دوسری روٹی کے لیے آٹے کو گول کرتے ہوئے اسی خیال میں گم تھا کہ دور سے اینا کی طوفانی آواز آئی۔

"Hi, Medi! Hi, Saleem! Hi, Jenny!"

سب کو ایک سانس میں بھگتا دیا۔ پھر فوراً ہی پوچھا:

"Whose is the stupid bird?"

"Mine. Mine."

جینی نے منمنا کر کہا۔

"I bet it is."

اینا نے بدمعاشوں کی طرح جینی کو جواب دیا اور مجھ پر حکم شاہی صادر فرماتے ہوئے کہا:

"I'll see you in the corner room, Saleem."

اور دوڑ کر بالائی منزل پر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

میں اتنے میں ہی خوش ہو گیا۔ جلدی جلدی جینی اور میڈی سے خود کو معذرت دلوائی اور دو پلیٹوں میں کھانا لیا اور دو گلاسوں میں لیموں پانی ڈال کر کارنر روم میں رکھ آیا۔ پھر ایک پلیٹ پر اپنی بنائی ہوئی ایک گول گول روٹی لے کر کارنر روم کی گول میز پر آ بیٹھا۔ اینا آئی تو اس سے پہلے کہ سوئمنگ کے حوالے سے کوئی دل کُش بات بتاتی، میں نے بڑی چاہت سے کہا:

"You know what, Anna? I made a Pakistani roti for you."

"Pakistani what?"

"Pakistani roti. R.O.T.I"

"Sounds good."

اینا نے انتہائی بھارتی قسم کا منہ بناتے ہوئے کہا۔

"And it's eaten like this...."

میں نے روٹی کا ایک نوالا توڑ کر اس کا چمچا بنایا اور سالن میں بوڑ کر اس کے منہ کے پاس لے گیا مگر اینا نے بائیں ہاتھ کے اشارے سے میرے نوالے کو واپس کر دیا اور کہا:

"Oh, I'm sorry, Saleem. We stopped at Wendy's and had burgers. You take it, please."

اس کے we پر ایک لمحے کے لیے مجھے لیش اور اینا وینڈیز کی چھوٹی چھوٹی کرسیوں پر برگر کھاتے ہوئے نظر آئے۔ اگر اینا نوالا نہ لینے کی یہ حرکت میرے گاؤں کے کسی اور مرد کے ساتھ کرتی تو وہ غصے سے لال پیلا ہو جاتا اور کہتا: ''لعنت بھیجتا ہوں مَیں تمہارے منہ پر اور تمھاری سات پشتوں کی محبت پر اور بھارتیوں سے ان کی رنگ رلیوں پر۔'' اور خود سے عہد کرتا کہ آئندہ کبھی بھی تکلفات کی یہ طشتری نہیں سجانی۔ مگر مَیں تلاشِ محبت کا مسافر تھا اور اس کی نیلی آنکھوں کا سمندر مجھے محبت کے موتیوں سے بھرا دِکھتا تھا۔ لہٰذا مجھ پر برداشت کی سبھی شقیں لاگو تھیں۔

"I'll be right back."

اینا واپس آنے کا عندیہ تھما کر چلی گئی اور میں خاموشی سے خستہ روٹی کے نوالے توڑ توڑ کر اِس فخر کے ساتھ کھانے لگا کہ یہ روٹی Wendy's کے اُن برگروں سے تو ہزار گنا بہتر ہے جو "we" نے کھائے تھے۔

--☆--

علی الصبح کارنر روم میں کسی پرندے کے پھڑ پھڑانے کی آواز سے میں جاگ اٹھا۔ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ جینی اپنے ساسا کو لے کر کارنر روم کی ایک کرسی میں رونی سی شکل بنائے بیٹھی تھی۔ نیند سے اٹھتے ساتھ ہی چہرے پر جو ابتدائی تاثرات ہوتے ہیں انھیں ہمیشہ غور سے دیکھنا چاہیے کیوں کہ وہی سچے ہوتے ہیں۔ آنکھ پوری کھل جاتی ہے تو انسان کا مصنوعی پن تگڑا ہو جاتا ہے اور ایسے میں دماغ میں تیسرے درجے کی گھٹیا گالی بھی آ رہی ہو تو مسکراہٹ کی رسی سے باندھی جا سکتی ہے۔ معلوم نہیں میں نے نیند سے جاگ کر جینی کو کیسے دیکھا کہ وہ معذرت پر معذرت کرنے لگی۔

پھر بتانے لگی کہ اسے بھی ابھی ابھی پتہ چلا ہے کہ ساسا بدتمیز ہے اور شور کرتا ہے ورنہ کل جب سے وہ اسے لائی تھی سارا وقت بالکل خاموش سہما سا بیٹھا رہا۔ جینی نے یہ بھی بتایا کہ وہ خود اتنی جلدی اس لیے جاگ گئی تھی کہ اسے ساسا کو پوٹی کرانی تھی کیوں کہ پنجرے میں ساسا پوٹی کرتا نہیں اور وقت پر نہ کرائی جائے تو پیٹ پھٹنے سے اس کی موت واقع ہو سکتی ہے۔ مجھے وہیں لیٹے لیٹے ساسا کے حالاتِ زندگی میں دل چسپی لیتے دیکھ کر اس نے مجھے افسردگی سے بتایا کہ صبح ساسا کی آنکھوں کے کونوں میں میل تھا جس کا مطلب ہے کہ یہ بیمار ہے۔ اس پر میں نے جینی کو اپنے گاؤں کے ان بچوں کا بتایا جن کی آنکھوں کے کونے، ناکوں کے نتھنے اور کانوں کی کانیں ہمیشہ میل سے بھری رہتی ہیں۔ وہ بڑے ہو کر نہ صرف کھوتوں کی دوڑ میں حصہ لیتے ہیں بل کہ کچھ تو ڈاکٹر انجینئر بھی بن جاتے ہیں اور بعض تو کولوراڈو یونی ورسٹی میں آ کر ایم اے انگلش بھی کرتے ہیں۔ اس آخری بات پر جینی ہنس دی اور اک ادا سے ''سلیم!'' بولا۔

اور ساسا کو چومنے لگی۔

--☆--

﴾۷﴿

میں نے شام کا کھانا کھایا اور سعودی بھائی خالد کو GRE کے امتحان سے متعلق کچھ ہدایات دیں اور پھر اینا کے ساتھ پول ٹیبل پر چلا آیا۔ ہم وہیں کھڑے تھے کہ بالائی منزل پہ کہرام مچ گیا۔ روتی ہوئی جینی کی پہلے آواز آئی اور پھر وہ خود۔ ہمیں یہ سمجھنے میں کچھ دیر لگی کہ ساسا کو کچھ ہو گیا تھا۔ جینی اسے ہسپتال لے جانا چاہتی تھی۔ مگر ایمبولینس بلانے کے لیے اس سے بات نہیں ہو پا رہی تھی۔ اس نے موبائل پر نمبر بھی ملایا ہوا تھا چناں چہ آگے آ کر موبائل اینا کو پکڑایا اور فوراً پتہ سمجھانے کو کہا۔

آناً فاناً ایمبولینس آئی اور میں تھوڑی ہی دیر میں اپنے ہاتھ میں قدرے سست ساسا کو اٹھائے اس کے اندر بیٹھا تھا۔ اینا جینی کو دلاسے دے رہی تھی کہ "Sasa will be alright." جینی رو بھی رہی تھی اور جیز ز کرائسٹ سے دعائیں بھی مانگ رہی تھی۔ یہ دعائیں سن کر مجھے نمل یونی ورسٹی کی وہ لڑکیاں یاد آ رہی تھیں جو ''اللہ جی، اللہ جی'' کر کر کے دعا کیا کرتی تھیں کہ کسی بھی طرح پرچہ ایک دن کے لیے ملتوی ہو جائے، چاہے اس کی وجہ اور قیمت کوئی بھی ٹھہرے۔ چھوٹا موٹا دھماکا ہو جائے یا تیسری جنگِ عظیم چھڑ جائے مگر یہ پریزنٹیشن آگے ہو جائے، اللہ جی ی ی ی ی۔۔۔

ہسپتال پہنچ کر اینا نے مجھ سے ساسا کو لے لیا اور مجھے جینی کو کہیں بٹھانے کا کہہ کر خود ڈاکٹر کے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے گردن کے گھوم سکنے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک ڈیسک

ڈھونڈا اور جینی کو اس طرف لے جا کر بٹھا دیا۔

"Sasa, please get well soon. You are my life. My dearest friend in the world.
Will he be alright, Saleem?"

جینی نے وقتِ نزع کے بین سے وقفہ کر کے مجھ سے پوچھا۔

"Yes, it will be. It will be fine."

میں نے اپنے ''تیسری دنیا پن'' کو جھٹکتے ہوئے کہا۔ مگر میری دنیا کے تلخ حقائق اس مضحکہ خیز صورت حال کا تو الگار رہے تھے۔ جس پر مجھے ہنسی بھی آ رہی تھی اور رونا بھی۔ ہنسی اس لیے کہ جینی نے معلوم نہیں کیوں خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بنا لیا تھا۔ کیوں کہ اس کا ساسا کی بیماری پر رونا اور ہم سے بھی دھاڑیں مارنے کی توقع کرنا ایسا ہی تھا جیسے الماس بوبی اپنا حمل ضائع ہو جانے پر ملک بھر کے ہیجڑا و غیر ہیجڑا افراد کو تین یوم کا سوگ منانے کا کہہ دے۔ اگر یہ میرا گاؤں ہوتا تو اب تک بسم اللہ اللہ اکبر پڑھ کر ساسا کو حلال کیا جا چکا ہوتا۔ پھر جو موذی مرض وہ بتا رہی تھی وہ یہ تھا کہ ساسا اونگھ رہا تھا اور میرے نزدیک یہ اونگھنا ان سب الا بلا چیزوں کی وجہ سے تھا جو جینی سارا دن ساسا کے منہ میں ٹھونستی رہی تھی۔

چند ہی روز پہلے میں نے ایک خبر پڑھی تھی۔ تھر میں قحط سالی سے قریب دو سو بچے مر گئے تھے، کچھ ماؤں کے رحموں میں جب کہ بہت سارے گودوں اور پنگھوڑوں میں اور میں تھا کہ ایک پرندے کی overeating یا over feeding کا علاج کروانے ایک بہت ہی صاف ستھرے اور جدید قسم کے ہسپتال میں آ کر مصنوعی سنجیدگی کا ڈھونگ رچائے بیٹھا تھا۔

"If sasa passes away....."

جینی نے ہوا میں گھورتے ہوئے کچھ کہا مگر میرا دماغ passes away کو جمپنگ پیڈ بنا کر George Carlin کے ۱۹۹۰ء میں HBO پر بولے گئے ان شہرہ آفاق جملوں کی طرف گیا

جواس نے امریکی زبان میں بڑھتے ہوئے euphemism کی شان میں کہے تھے۔

"Thank you, Saleem, for always being there."

جینی نے میرے ہاتھ پر اپنا آنسوؤں والا گیلا ہاتھ رکھا تو میں چونک گیا۔

"You have always been there in testing times!"

جینی بالآخر میرے لیے فضا کو سوگوار بنانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ مجھے ذرا سا احساس جرم بھی ہوا۔

"You don't have to say that, Jenny."

میں نے گویا امریکی حقائق کو گلے لگاتے ہوئے اس کے کاندھے کو پکڑا اور ہلکا سا ہلا کر کہا۔

دھیرے دھیرے مجھ پر ایک کیفیت طاری ہوئی اور مجھے پاس بیٹھی اس نرم و نازک، گڑیا نما لڑکی پر پیار آنے لگا۔ وہ رحم دل تھی، حساس تھی۔ محبت اور رومان کے جذبوں میں گندھی ہوئی ـــ مگر تنہا تھی۔ اس کی محبت تخیلاتی تھی اور اس کا اظہار استعاروں میں تھا: ٹیڈی بیئر سے پیار، ساسا سے محبت، ڈیو کی شرٹ سے انس۔ اگر اینا میری محبت نہ ہوتی تو میں جینی کو اپنانے میں کبھی دیر نہ کرتا۔

خبر نہیں اینا اندر کیا کہانی کر رہی ہے۔

میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ڈاکٹر کے کمرے کا دروازہ کھلا اور اینا ایک فائل اٹھائے باہر آ گئی۔

"Jenny, Sasa's stomach needs to be operated."

اینا نے اسے فائل پکڑاتے ہوئے کہا۔

ساسا کا ایکسرے اور الٹرا ساؤنڈ ہو چکا تھا۔ رپورٹ کے مطابق اس کے پیٹ میں کوئی ٹھوس شے اٹکی ہوئی تھی جسے نکالنے کے لیے ساسا کو فوراً آپریشن تھیٹر لے جانا تھا۔ تاہم نشہ دینے سے پہلے ڈاکٹر تحریری اجازت نامے پر ساسا کی وارث کے دست خط لینا چاہتا تھا۔ ساتھ ہی اینا نے جینی سے وہ سٹیفکیٹ بھی مانگا جس کے مطابق جینی ساسا کی "pet's

parent" تھی، سنگل پیرنٹ۔ جینی نے کانپتے ہاتھوں سے فائل پکڑی اور مندرجات کا مطالعہ کرنے لگی۔ فارم پر آپریشن کا متوقع دورانیہ، کامیابی کا تناسب، ساسا کے پیٹ پر چلنے والے آلات جراحی کی تفصیل، اور کل خرچ درج تھا۔ دست خط کرنے سے پہلے جینی نے فارم کے نیچے لف ایکسرے اور الٹرا ساؤنڈ پر بھی ایک نظر ڈالی۔

ساسا کے معدے کے عکس دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ صبح جب میں ساسا کو کندھے پر بٹھائے کارنر روم سے رات والے برتن اٹھا کر لے جا رہا تھا تو ساسا نے ایک پلیٹ میں سے روٹی کا ایک سوکھا ٹکڑا کھا لیا تھا۔

وہ سائن کرنے ہی والی تھی کہ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "Jenny, Nooooooo."

"It's just a little piece of roti, and it is quite digestible. We need to wait.

جینی کے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم تھا کہ میں کیا کہ رہا ہوں مگر میں نے اس قدر اعتماد سے کہا کہ جینی نے میری آنکھوں میں دیکھ کر فائل مجھے دے دی۔ میں نے دیکھا کہ اینا نے سر اٹھا کر چھت پر نظریں ڈالیں جیسے خدائے مسیح کا شکریہ ادا کر رہی ہو، کل میری روٹی نہ کھانے پر۔ فائل لے کر میں اندر ڈاکٹر کے پاس چلا گیا۔ ڈاکٹر روئی کا ایک گیلا پھوا ساسا کے منہ کے پاس لیے ہمارے اشارے کا منتظر کھڑا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ ہمارا خیال ہے کہ ساسا کے پیٹ میں جو بھی ہے کچھ دیر میں ہضم ہو جائے گا سو ہم کچھ دیر انتظار کرنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر نے نشے والی روئی تو فوراً ہٹا لی مگر مجھے معاملے کی شدت پر لیکچر دینا شروع کر دیا۔ وہ مجھے ساسا کی زندگی کو خطرے میں نہ ڈالنے پر قائل ہی کر رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور اینا ڈاکٹر کی فیس لے کر اندر آ ئی۔ ڈاکٹر کی نظر باہر ایک نوجوان پر پڑی جو ایک puppy کو لے کر بے صبری سے ڈاکٹر کے فارغ ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔

"Alright."

ڈاکٹر نے دونوں ہاتھ اپنے گنجے سر سے اوپر لے جا کر کہا۔

”جیسے آپ کی مرضی۔ یہ لیجیے میرا ایمرجنسی کارڈ۔ اگر مریض کے درد کی شدت بڑھے تو کال کر لیجیے گا۔ اس دوران میں اچھا ہوگا اگر آپ اپنے پرندے کی ہیلتھ اِنشورنس کروالیں۔ یہ لیجیے ایک بہت ہی قابلِ اعتبار انشورنس کمپنی کا نمبر، یہ صرف پرندوں کی انشورنس کی کمپنی ہے۔“

سرجن صاحب نے ہمیں دو کارڈ تھمائے اور ہمارے باہر نکلنے سے پہلے ہی اس پلے والے نوجوان کو اندر بلالیا۔

--☆--

ایک مرتبہ ابو جی کا ایک گھوڑا بیمار ہوگیا اور کئی دن اور ڈھیر سارے دیسی ٹوٹکے گزر جانے کے باوجود بھی ٹھیک نہ ہوا۔ ہمارے گاؤں کے مغرب میں تقریباً بیس میل کے فاصلے پر کوہِ سلیمان کے سنگ لاخ پہاڑوں کے دامن میں ایک غار نما جگہ کے آگے ایک جھونپڑی تھی جس میں ایک پکی عمر کا باریش بابا رہتا تھا۔ اسے سب 'روزہ پیر' کہتے تھے۔

روزہ پیر ہمیشہ روزے سے رہتے۔ لوگ انہیں وَنگ وَنگ کی اشیا پیش کرتے مگر وہ کبھی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگاتے۔ ہمارے گاؤں سمیت سیکڑوں گاؤں کے کئی لوگ اپنے دنیاوی ونفسیاتی وجنسیاتی مسائل کے حل کے لیے روزہ پیر ہی کو حاضری دیتے۔ کسی کا بچہ بیمار ہوجاتا، بھینس چوری ہوجاتی، گدھے کی ٹانگ کا جوڑ ہل جاتا، بڑے بوڑھے کا پیشاب آنا بند ہوجاتا، کپاس کی فصل کو امریکی سنڈی کھانے لگتی، گنے کے کھیت کو سیہہ اکھاڑنے لگتی، کسی کے دماغ کو مرغوں کی لڑائی پر جوا لگانے کی خارش پڑتی، سب پہلا کام یہ کرتے کہ روزہ پیر کے حضور حاضری ڈال آتے سوائے میری اور منزہ کی امیوں جیسی عورتوں کے جن کے سخت شوہر انھیں روزہ پیر تک جانے نہ دیتے، یا ان چند کنجوسوں کے جو گاؤں کے مشرق میں واقع سائیں بابا کے کیکر سے مفت سایہ سمیٹتے رہتے۔

منہ سے روزہ پیر بھی کبھی کوئی پیسے نہیں مانگتے تھے مگر کوئی ان کی میز پر بچھی چادر میں اپنی مرضی سے کچھ رکھ دیتا تو ناراض بھی نہ ہوتے۔ کچھ ہوشیار لوگ بند مٹھی کو میز پر پڑے پیسوں کی

ڈھیری کے پاس لے جاتے، میز کو انگوٹھا لگاتے اور خالی مٹھی کھول دیتے۔ پھر روزہ پیر کو اپنا مسئلہ بتاتے، اس کا حل سنتے اور دعائیں لے کر لوٹ جاتے، مگر دل ہی دل میں یہ عہد ضرور کر لیتے کہ اگر مراد پوری ہوگئی تو ایک دن روزہ پیر کا قرض چکانے ضرور آئیں گے۔

دعا مکمل ہونے کا عندیہ روزہ پیر دائیں ہاتھ کی چٹکی بجا کر دیتے۔ قبول کروانے کے لیے عمل بتاتے اور عمل ایک ہی تھا: روزہ۔

کسی کے لیے ایک پہر کا، کسی کے لیے سوا کا، کسی کو پورے دن کا اور کسی کے لیے پورے چالیس دن کا اور وہ بھی بلا ناغہ۔ بہو بیمار پڑتی تو ساس کو روزہ کرواتے، سسر بیمار ہوتے تو بہو کو۔ بھائی کی تکلیف کے لیے بہن کو، کبھی کبھی ایک ہی مسئلے کے لیے کئی لوگوں کو روزہ رکھنے کا حکم صادر کر دیتے۔ ان مَنتی روزوں کی ترکیب اس تیزی سے بدلتے کہ نقال ایک فارمولا سمجھنے ہی والے ہوتے کہ قدیمی، نسلی روزہ پیر کو غیبی مدد میسر آتی اور وہ روزے کی ہیئت میں ایسی تبدیلی لاتے کہ تخلیقی پن میں اسٹیو جابز تک کو مات ہوجاتی۔ ان کے اپنے مؤکل اور فرشتے بھی سر دھنتے رہ جاتے۔

ابو جی کو ان چٹکیوں وغیرہ پر کوئی خاص یقین تو نہ تھا مگر جب عقل مند دکھائی دینے والے رشتہ دار عزیزوں نے اصرار کیا اور علاج معالجے سے مایوسی ہوئی تو اپنے پسندیدہ گھوڑے کی محبت کے جوش میں آ کر ایک روز وہ بھی روزہ پیر کے ہاں جانے پر رضامند ہوگئے۔

شام کا پہر تھا؛ گرمیوں کا سورج کوہِ سلیمان کی آغوش میں اُترنے لگا۔ روزہ پیر گھنی سفید بھوؤں کے حصار میں آنکھیں ڈھانپے ایک چبوترے پر تکیے کی ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ چبوترے کے سامنے وہ میز پڑی تھی جس پر بچھی چادر میں لوگ بن کہے پیسے رکھ دیتے تھے۔ اردگرد بیس پچیس لوگ زمین پر اور تقریباً اتنے ہی کوے جھونپڑی کے سامنے لگے کیکر پر بیٹھے پیر سے لو لگائے ہوئے تھے۔ ابو جی، رمظی اور میں قریب پہنچے تو کسی نے اونچی آواز میں کہا ”سردار صاحب آگئے ہیں۔ کاٹھ گڑھ کے سردار ضیاء الدین بلوچ آگئے ہیں۔“ روزہ پیر نے ابو جی سے

ہاتھ ملایا اور انہیں زمین پر بیٹھنے کے بجائے پیسوں والی میز پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ چناں چہ ابو جی میز پر بیٹھ گئے، میں ان کے پاس کھڑا ہو گیا جب کہ رمظی پیچھے گھوڑے پکڑ کر ٹھہرا رہا اور وہیں کھڑے کھڑے بیمار گھوڑے کی شکل صورت سے لے کر نسل تک اور بیماری کی وجہ سے لے کر ممکنہ علاج تک سب کچھ بتا دیا اور تب تک نہ رکا جب تک روزہ پیر کے ایک فقیر نے غصے سے ''چپ کر وَئے سور دا پتر آ'' نہیں کہا۔

روزہ پیر نے سُرمے بھری آنکھیں کھولیں، دایاں ہاتھ فضا میں بلند کیا، سر کو دائیں لا کر بائیں جھٹکا جیسے ہاتھ کو چابی دی ہو اور پھر چٹکی بجادی۔ پھر کہا ''آپ کا گھوڑا ٹھیک تین دن بعد ٹھیک ہو گا۔ اگر تب تک آپ نے نمکین روزے رکھے تو۔'' نمکین روزے سے مراد یہ تھی کہ سحری کی نیت پڑھنے سے پہلے اور افطار کی نیت کے بعد بالترتیب آخری اور پہلی چیز جو حلق میں اترے وہ نمک ہو۔

''بزرگو، میں تو گردوں کا مریض ہوں، روزہ نہیں رکھ سکوں گا۔ کوئی اور عمل ہو تو بتا دیں؟'' ابو جی نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور روزہ پیر نے کچھ دیر کے لیے چھوٹی چھوٹی آنکھیں، جن کو سرمہ دانیاں کہنا زیادہ مناسب ہو گا پھر میچ لیں۔ پھر جو کھولیں تو ان کے حصار میں مَیں تھا۔ میرا دل معافی ترلے کرتا زور زور سے دھڑکنے لگا کہ پورے کے پورے تین روزے اس ناچیز پر پڑنے والے تھے۔

''کُل کتنے ڈھور ڈنگر ہیں، سردار صاحب؟'' انھوں نے ابو جی سے پوچھا تو میری جان میں جان آئی۔ ''دس بارہ بھینسیں ہیں، وچھے وچھیاں ملا کر کل تیرہ گائیں ہیں، بیس بائیس بکریاں ہیں اور چھ گھوڑے، دو گھوڑیاں ہیں۔'' انہوں نے بے دلی سے بتایا۔
''بس بیمار گھوڑے سمیت سا!!!!!!!!!!ب کو تین روزہ یک مشتا رکھوائیں۔'' یہ کہہ کر روزہ پیر نے سر جھٹکا اور چٹکی بجادی۔ ایک لمحے کو تو ابو کو ان کی بات سمجھ نہیں آئی۔ مگر جب پتہ چلا کہ پیران کے مال مویشیوں کو تین دن مسلسل بھوکا رکھنے کا کہہ رہے ہیں تو غصے سے ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ پیسوں

والی میز سے اٹھتے ہوئے انھوں نے اپنا صافہ یوں زور سے جھٹکا کہ اس میں سے دھماکے کی سی آواز آئی۔ روزہ پیر کے چہرے کا رنگ اور کیکر پر بیٹھے کوے فوراً اڑ گئے۔
''چل اوئے رمظی آ!'' ابو جی نے اس کے ہاتھ سے اپنے گھوڑے کا لگام تھامتے ہوئے غضب ناک آواز میں کہا۔ مجھے اپنے چلتے ہوئے گھوڑے پر چھلانگ لگا کر بیٹھنا پڑا۔

--☆--

آدھی رات بیت چکی تھی۔ ساسا پر ڈاکٹر کی گیلی روئی کا نشہ ابھی تک سوار تھا۔ ہم واپس آ کر کارنر روم میں جا بیٹھے تھے۔ میں مونگیا رنگ کے گداز صوفے پر بیٹھا تھا۔ اینا میرے بائیں طرف گول میز کی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھی سامنے پڑے موبائل پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ جب کہ جینی میرے سامنے پڑی میز کی دوسری طرف کرسی ڈال کر دیو قامت ایل ای ڈی کی طرف پشت کیے بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ساسا پاگلوں کی طرح انتہائی سُستی سے گردن گھما گھما کر مجھے اور اینا کو آدھی بند آنکھوں سے تک رہا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے وہ منہ کو یوں کھولتا جیسے جمائی لینے کا ارادہ باندھ رہا ہو۔ اینا کوئی چیز لینے اٹھ کر اپنے کمرے میں گئی تو ساسا نے پُو کر دیا اور خفت سے آنکھیں میچ لیں۔ میں نے اٹھ کر دونوں ہاتھ سامنے پڑے میز پر رکھے اور آگے جھک کر جینی کی پیشانی کو چُوم لیا۔ ساسا کی معدہ کُشائی اور میری اس شرارت نے گویا جینی کی جان میں جان ڈال دی۔ جواباً وہ مسکرائی اور مخمور آنکھوں والے ساسا کے سر کو چومنے لگی۔

صاف لگ رہا تھا کہ چھٹیوں کی یہ چوتھی رات تیمارداری کی نظر ہو چکی ہے۔ رات کے دو بج چکے تھے۔ اینا واپس آئی اور مجھے گڈ نائٹ کہہ کر اور جینی اور ساسا کے منہ پر بھی 'شب بخیر' مار کر سونے چلی گئی۔ کچھ دیر میں وہیں بیٹھا جینی کو کن اکھیوں سے دیکھ دیکھ کر کنفیوز کرتا رہا۔ بلش کر کر کے جینی کا چہرہ لال ہو گیا۔ جب بہت تنگ کر لینے کے بعد مجھے اس پر ترس آنے لگا تو میں اٹھا اور وہیں ٹہلنے لگا۔

پھر ذرا سی واک کے بعد میں نے جینی سے ساسا کو لیا اور کارنر روم کا عقبی دروازہ کھول

کر باہر بیس بال کے گراؤنڈ میں آ گیا۔ ساسا کو اپنے کندھے پر بٹھایا اور ٹراؤزر کی جیب سے سگریٹ اور لائٹر نکالا اور سلگا لیا۔ میں نے آنکھوں کے کونے سے جینی کو دیکھا جو سگریٹ کو سخت ناپسند کرتی تھی اور اس وقت میرے ہونٹوں میں اٹکے سگریٹ کو دیکھ کر شکلیں بنا رہی تھی۔ پھر اسے گھور کر دیکھا اور ایک لمبا سا کش لگا کر سارے کا سارا دھواں ساسا کے نتھنے سے حلق میں یوں اتار دیا جیسے منزہ کے دادا درد اتارنے کا علاج کرنے کے لیے حقے کا دھواں روتے ہوئے بچے کے کان میں پھونک دیتے تھے۔ اندر جینی کو جیسے کرنٹ لگا وہ ایک چھلانگ لگا کر اٹھی اور میری طرف دوڑی۔

"Are you crazy, Saleem?"

اس نے ناراضی سے کہا۔

"No, Sasa needs to wake up, and smoke helps in digestion too."

میں نے سگریٹ ساسا کی چونچ میں دیتے ہوئے کہا جسے ساسا نے ایک لمحے کو پکڑا اور پھر نیچے پھینک دیا۔ دھوئیں کا اثر تھا یا میرے دم کا ساسا نے ایک بار پَر پھڑ پھڑائے اور ہوشیار ہو گیا اور ساسا پھرتی سے اڑ کر جینی کے ہاتھوں میں جا بیٹھا جو ابھی دو تین قدم دور ہی تھی۔

"Now, would you mind thanking me for curing Sasa of its drowsiness?"

میں نے مطالبہ کیا۔

"Nope."

جینی نے کارنر روم کو پلٹتے ہوئے کہا۔ مگر اس کی چال سے ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ اس وقت لب و رخسار پر عرقِ مسکان کا چھڑکاؤ ہو چکا ہے۔ مسکراہٹ مابعد الطبیعیات کا مقناطیس ہوتی ہے سو اسی مقناطیست کے زیر اثر میں اس کے پیچھے پیچھے کارنر روم میں آیا اور نرم و گداز صوفے کے گرد چکر

لگانے لگا جہاں جینی ساسا کو ہشاش بشاش دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

جینی نے اونچی آواز میں ساسا کو بتایا کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے اور اس کے سوا اس کا کوئی نہیں ہے۔ اس لیے وہ مہربانی کرے اور فوراً ٹھیک ہو جائے اور پھر کبھی بیمار نہ ہو ورنہ اُس کی دنیا اجڑ جائے گی۔

"میں ہوں نا، جینی۔"

میں نے انگریزی زبان میں بالی ووڈ کا ایک گھسا پِٹا ڈائیلاگ بولا۔

"You're Anna's!"

جینی نے یوں برجستگی سے کہا جیسے اس بات پر خاصا غور و خوض کر چکی ہو۔

"You know what, in my culture one man can have four wives. Polygamy, you know!"

میں نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

"Nooooo. How is that even possible?"

جینی نے حیران آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"Why not? You, Anna, and those two indistinguishable chinese girls."

"Don't worry about me. I have my Sasa."

یہ کہہ کر وہ کارنر روم سے جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"Are you okay? This bird is a female."

وہ دروازے سے باہر نکل رہی تھی تو میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

--☆--

﴾۸﴿

مجھے صحیح طرح یادنہیں کہ اُس رات کو میں اپنے کمرے میں کس وقت گیا اور مُجھے نیند کب آئی مگر میں اٹھا اپنے بستر سے تھا۔ نہادھوکر ڈائننگ ہال میں گیا اور ایک پلیٹ میں سیریل اور دودھ ڈال کر چمچ سے کھانے پینے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہاں میڈی اور اس کا کتا ٹونی بھی آ نکلے۔ میں نے انھیں گڈ مارننگ بولا تو جواباً میڈی نے سر ہلایا اور ٹونی نے دُم۔

''یونو وَت، سلیم؟'' میڈی نے دور سے پاس آتے ہوئے کہا۔

"Jenny has gone to the hospital."

میں نے چمچ پلیٹ میں رکھ کر میڈی کی طرف دیکھا جو راز دارانہ انداز میں مسکرا رہی تھی۔ میرے دماغ کو معلوم نہیں کیا سوجھی کہ فوراً آبائی گاؤں کے ایک کھوتے کو استعمال کر کے ایک بھاری بھرکم گالی گھڑی اور جینی کے سابقہ بوائے فرینڈ ڈیوڈ کے منہ پر مار آیا۔

"What? Is she alright?"

میرے شک کا جواب اسی میڈی کے پاس ہی تھا۔

"Yes, she is alright."

اور پھر ذرا توقف سے:

''آر، مے بی نات۔''

میڈی مجھ سے پہیلیاں بجھوانے لگی اور میرا جی چاہ رہا تھا کہ یہ چمچ اٹھا کر میڈی کے کتے کے سر پر

دے ماروں جو اس وقت منہ کھولے ڈائننگ ہال کی ساری ہوا ہڑپ کیے جا رہا تھا۔

"She has taken sasa to the hospital."

میڈی نے کسوٹی کی ایک گرہ کھول دی۔

"Oh! Again? I thought it was improving."

میں نے خودکلامی کے انداز میں کہا اور چمچ بھر کر منہ میں ڈالا۔

"No. No. It was fine." میڈی نے پھر مسکرا کر ذرا اونچی سی آواز میں کہا۔

"Then why----?"

میں نے مشکل سے منہ کھولتے ہوئے پوچھنا چاہا۔

"To get it DNA-tested. She wanted to know Sasa's Sex."

میڈی نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا اور میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"Don't tell me. Is she crazy, Medi?"

''آئی دونت نو۔''

سہ پہر کے وقت میں اور نِک پُول کھیل رہے تھے کہ جینی ہسپتال سے واپس آئی اور فاتحانہ انداز میں مسکراتی ہوئی سیدھی پول ٹیبل پر آ گئی۔ نِک کافی دنوں کے بعد ہاسٹل واپس آیا تھا۔ سو اس نے ساسا کو دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا تو جینی نے اسے بتایا کہ یہ اس کا پالتو پرندہ ہے اور اسے ساسا کہتے ہیں۔

"And it's a male."

میں نے لقمہ دیتے ہوئے کہا تو جینی کا چہرہ لال ہو گیا۔ وہ دوڑ کر میرے پاس آئی اور میرے بازو پر ایک ننھا سا مُکا دے مارا۔ میں نے اس کی چھوٹی موٹی بے عزتی کی جس میں نک نے حسب توفیق ہنس ہنس کر حصہ ڈالا۔ پھر اچانک میں نے جینی کو ایک مشورہ دے ڈالا۔

"Why don't you find a partner for him?"

"How did you know that? I was just thinking of that, Saleem."

جینی نے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"Great minds think alike."

میں نے آنکھ مارتے ہوئے کہا تو جینی ساسا کو والہانہ چومنے لگی جب کہ میں واپس نک کے ساتھ پُول کھیلنے لگا۔ کھیل میں اس قدر مشغول ہوا کہ مجھے جینی اور ساسا کی وہاں موجودگی کا احساس ہی نہیں رہا۔ ایک بار میں شاٹ کھیلنے کے لیے پول پر جھکا تو پیچھے سے آ کر جینی نے ساسا کو میرے کندھے پر بٹھا دیا۔ بیٹھتے ساتھ ہی ساسا نے میرے ننگے کندھے پر پنجے گاڑھ دیے۔

"Hey, hey! It hurts, Jenny."

میں نے محبت بھری ناراضی سے کہا۔

"Sasa loves you, Saleem."

جینی نے بے نیازی سے کہا۔

"I already told you it's abnormal."

میں نے وہیں جُھکے جُھکے کہا اور جملے کے آخری لفظ کو ادا کرتے ہوئے یوں زور کا شاٹ لگایا جیسے یہ بال پر نہیں، ''ابنارمل'' پر مارا ہو۔ سہم کر ساسا نے میرے کندھوں پر اپنی گرفت مزید مضبوط کی اور میرے منہ سے بے اختیار ''Ouch'' نکلا۔ میں سیدھا ہو کر جینی کی طرف مڑا، نک پیاس کا بہانہ بنا کر کچن کے اندر چلا گیا، مگر نمل یونی ورسٹی کے میرے ہم جماعتوں کی طرح ساسا بے حیائی سے کباب کی ہڈی بنا بیٹھا رہا۔ جینی نے پہلی بار میری آنکھوں میں جھانک کر یوں دیکھا جیسے ان میں اپنا کچھ گُم کر بیٹھی ہو۔ چند لمحوں بعد آہستہ سے کہا:

"I bet one guy is very normal here."

اور دو قدم آگے آئی۔ میرے پاس۔ بہت قریب۔ اس قدر نزدیک کہ اگر ساسا میرے کندھے سے اُڑ کر میرے سر پہ آ بیٹھتا تو اس کے بارے میری ٹھوڑی ڈھلک کر جینی کی ناک سے اور ہونٹ اُس کی پیشانی سے مس ہو جاتے۔ مگر ساسا تماشائے حسن و عشق کی اس تمہید کو انہماک سے دیکھا کیا اور کاندھے کی مسند کو نہ چھوڑا۔ کچھ دیر بعد جینی نے آہستہ آہستہ اپنا دایاں ہاتھ اٹھایا اور میرے سینے پر عین اس جگہ پھیلایا جہاں دیوارِ دل ہوتی ہے۔ پسِ دیوار میرے دل نے اس کی انگلیوں کی پشت پر اپنا ماتھا ٹیک دیا۔ اسی اثنا میں ساسا ننھے ننھے قدم اٹھاتا میری سلیولیس شرٹ کے سہارے سے اتر کر جینی کے دستِ دراز میں اس کی کل کائنات بن کر جا بیٹھا۔ ساسا کو لے کر جینی جانے لگی تو میں نے خودستائشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی تائید کی۔

"You are right. That one guy is very normal."

جینی نے جاتے جاتے کندھے کے اوپر سے گردن گھما کر پیچھے دیکھا اور کہا:

"And handsome too."

میں جھنجھلا کر رہ گیا۔ جینی کو واپس جاتا دیکھ کر نک کچن سے باہر آ گیا۔ وہ جینی کی آخری بات پر زیرِ لب مسکرا رہا تھا مگر میں نے سنجیدگی کی دیوار اُستوار کر کے نک کو گیم پر توجہ دینے پر مجبور کر دیا۔

نک میرا بہت ہی اچھا دوست ثابت ہوا تھا۔ وہ کبھی اپنا کوئی فیصلہ مجھ پر مُسلط نہ کرتا۔ البتہ میں نے جب بھی کہیں جانے کا، کچھ کھانے کا یا پول وغیرہ کھیلنے کا کہا تو ہمیشہ اسے تیار پایا۔ وہ کنیکٹیکٹ سے آ کر کولوراڈو یونی ورسٹی میں بی اے انگلش کر رہا تھا۔ اس کی گرل فرینڈ یوسی ایل اے میں پڑھ رہی تھی۔ مہنگے شہر اور یونی ورسٹی کے اخراجات برداشت کرنے کے لیے وہ ہر ماہ کچھ خاص رقم نک سے بھی منگواتی تھی۔ جس کے لیے نک کو ہر ہفتے آٹھ دس گھنٹے کام کرنا پڑتا اور کبھی کبھی کوئی اسائنمنٹ یا پراجیکٹ جمع کرانے میں تاخیر ہوتی تو مجھے مدد کے لیے تیار پاتا۔ ہم دونوں پول ٹیبل ہی پر اپنے اپنے لیپ ٹاپ لے کر بیٹھ جاتے اور نک کی اسائنمنٹ ڈیڈ لائن سے چند منٹ قبل مکمل کر کے submit کا بٹن دبا دیتے اور وہیں ڈائننگ ہال ہی میں ناچنا شروع

کر دیتے۔

"Who's on your mind? Anna... or Jenny?"

مجھے محوِ خیال دیکھ کر نک نے شرارتاً پوچھا۔ میں نے پول ٹیبل سے سر اٹھایا اور نک کو چڑانے کے لیے کہا: ''یو سی ایل اے۔'' میرا اشارہ اس کی گرل فرینڈ کی طرف تھا۔ نک نے شرما کر "Come on, Saleem." کہا اور شاٹ پر شاٹ لگا کر بالز کو ہولز میں ڈالنے لگا جب کہ میں اس کے سوال پر غور کرنے لگا۔

جینی کی محبت زیادہ رس دار تھی اور اس کا اظہار دل کو موہ لینے والا تھا۔ اس کا حسن مغربی مگر اسلوب مشرقی تھا۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی صورتِ حال سے رومان کا ایسا رنگ دار پہلو نکال لاتی کہ سواد سا آنے لگتا، سرور کو تادیر بحال رکھتی۔ سامنے آتی اور دفعتاً اوٹ میں چلی جاتی۔ سوالوں کا جواب اس قدر من موہنے پن سے دیتی کہ محبت کی ملوک زادی انارکلی بھی حیرت کی انگلی منہ پر رکھ لیتی۔ اپنے دِھرتے کی بہ دولت وہ اینا کی ضد تھی۔ جینی سے مل کر مجھے لگتا میں کسی داستانِ محبت کا البیلا ہیرو ہوں۔ میں خود پسندی کر کے بھی اپنی نظروں میں قد آور رہتا۔ شاید انسان کا خود کو چاہنا کسی حد تک ضروری بھی ہوتا ہے۔ گو اس چاہت کی میزان سنبھالنا بھی اک امتحان سے کم نہیں کہ توازن ذرا سا بھی بگڑ جائے تو انسان بھٹک کر کبریائی کی طرف نکل جائے۔ مگر محبت کا میٹھا میٹھا شربت پلا سکنے کے قابل ہونے کے لیے جس پھل دار شجر کی ضرورت ہوتی ہے، اُس کی پنیری خود میں لگانی پڑتی ہے۔

یہ اینا کہاں گم ہو گئی ہے؟

نک سے گیم ہارتے ہی میں نے فون اٹھایا اور بنا سوچے نمبر ملا لیا۔ ابھی نک ہال سے نکلا ہی نہیں تھا کہ کال اٹینڈ ہو گئی۔ اینا نے بتایا کہ وہ سوئمنگ پول میں ہے اور اس نے لیش کے ساتھ ایک تصویر بنانے کے لیے موبائل اٹھایا تھا کہ وہ بجنے لگا اور اس نے اٹینڈ کر لیا یہ دیکھنے سے پہلے کہ "Who the heck it was?" اب لیش اس کی کال ختم ہونے کا انتظار

کر رہا تھا۔ چناں چہ ''بائے، سی یا۔'' پر یگمیٹیکلی دیکھیں تو 'بائے' سے اس کی مراد تقریباً 'دفع ہو' تھی اور 'سی یا' سے 'بھاڑ میں جا'۔

اگر اس روز میرے دل کے تاروں پر جینی سانسوں کا منتر نہ پڑھ گئی ہوتی تو یوں ٹوٹ کر بکھرتے کہ دنیا بھر کے چُو ہڑے مل کر بھی کوشش کرتے تو انہیں چُن نہ پاتے۔

پھر مجھے یاد آیا کہ اینا نے تو یہ بات فیس بک پر بھی لکھ دی تھی کہ سوئمنگ کے لیے جا رہی ہے۔ یاد رکھتا تو یہ خفت نہ اٹھانی پڑتی۔ انہی سوچوں کو لے کر میں کافی میکر سے ایک کپ کافی کا بھر کر اپنے روم میں آ گیا۔ وہاں بیٹھتے ساتھ ہی میں نے لیپ ٹاپ کھولا اور فیس بک پر نیوز فیڈ کو اسکین کرنے لگا۔

پاکستان سے ایک دوست نے ایک بکرے کی تصویر لگائی تھی جس پر ''اللہ'' لکھا تھا اور کیپشن تھا ''اس تصویر کو شیئر نہ کرنے والے پر اللہ کی ۱۰۰۰ بار لعنت ہو۔'' ایک 'فرینڈ' نے فیصل مسجد میں نمازِ جمعہ کا منظر لکھا تھا ''بہت ہی بڑا اکٹھ تھا مومنوں کا، روح پرور مناظر تھے۔ بندے پر بندہ چڑھا ہوا تھا۔ لاکھوں لوگ تھے۔ کم سے کم پانچ سو لوگوں کی تو جیبیں کٹ گئیں۔'' کسی نے عمران خان کے ایک جلسے کی بہت پُر رونق تصویر لگا کر لکھا تھا ''محفلِ رقص و سیاست۔''

کولوراڈو یونی ورسٹی کے خلائی ٹیکنالوجی کے پیج پر یہ خبر تھی کہ ڈیپارٹمنٹ نے مریخ پر مصنوعی سیارہ بھیجنے اور وہاں کی مٹی کا مطالعہ کرنے کے لیے ایک ملٹی بلین ڈالر کا میگا پراجیکٹ حاصل کر لیا ہے۔ یونی ورسٹی کی مسلم سٹوڈنٹس آرگنائزیشن اور ساؤتھ ایشن سٹوڈنٹس آرگنائزیشن نے ڈرون حملوں پر ایک سیمینار کی خبر شیئر کی ہوئی تھی۔ جس میں نوم چومسکی کے کسی دوست نے گفت گو کرنی تھی۔ اس پر تو جانا بنتا ہے میں نے ذہنی نوٹ لیتے ہوئے خود سے کہا۔

مگر جو خبر سب سے زیادہ شیئر ہوئی ہوئی تھی وہ یہ تھی کہ بھارت نے کرکٹ کے ایک سیمی فائنل میچ میں پاکستان کو ہرا دیا ہے۔ اس خبر کو پڑھ کر مجھے برسوں بعد بچپن کے وہ دن یاد آ گئے

جب پاکستان کے ہارنے پر منزہ اتنا روتی تھی کہ اس کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں اور ناک بہنے لگتی۔ بھارتی میڈیا کی ہتک آمیز رپورٹس آ رہی تھیں۔۔۔'اور اینا اس یش کے ساتھ۔۔۔' میرا خون کھولنے لگا۔ جی میں آیا کہ ابھی اڑ کر انڈیا جاؤں اور فائنل میچ کے دوران ان پر اتنی ہوٹنگ کروں، اتنی ہوٹنگ کروں کہ دھونی، یووراج، ویرات سب بوکھلا جائیں اور غلط شاٹس کھیل کر بلنج ہوتے جائیں۔ مگر ظاہر ہے ایسی باتیں منزہ کو چپ کرانے کے لیے تو ٹھیک تھیں، چل جاتی تھیں مگر اب ان سے میرے دل کی آگ کہاں ٹھنڈی ہو سکتی تھی۔

سو میں تو انڈیا نہ جا سکا، البتہ شام کے وقت یش ہمارے ہوسٹل میں ضرور آ گیا۔ اینا کے پیچھے پیچھے بوجھل قدم اٹھاتا سانولی رنگت، پتلی ٹانگوں اور گھنی بھنوؤں والا ایک یبُوست زدہ سالڑ کا ہاسٹل میں داخل ہوا تو میں ڈائننگ ہال کی سب سے بڑی ٹیبل پر بیٹھا اکیلا ڈنر کر رہا تھا تاکہ اینا سے پرسوں میرے ساتھ ڈنر نہ کرنے کا بدلہ لے سکوں۔

"Hi Saleem. This is Yash. Yash, this is Saleem."

اینا نے مجھے یوں روکھے پن سے "ہائے" بولا جیسے امریکا اپنے سابقہ دوستوں سے بولتا ہے۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو اینا کے گاگلز میں مجھے اپنا عکس نظر آیا۔ میرے چہرے سے دوہری شکست خوردگی عیاں تھی۔ میں اپنے عکس میں گم ہی تھا کہ اینا نے گاگلز اتارے اور اپنی آنکھوں کا اجنبی پن وا کیا۔

"سلیم بھائی، تھکے تھکے لگ رہے۔ رات میچ دیکھا کیا؟" یش نے ہندی میں کہا جو مجھ تک آتے آتے اُردُو ہو گئی۔ میں چُپ رہا اور کچھ بھی نہ کہا۔۔۔ مگر یش نے شاید cool dude بننے کی ٹھانی ہوئی تھی۔ "ارے، کن خیالوں کے درواجے کھولی بیٹھے ہیں، سلیم بھائی؟" اب کے جی میں آیا اسے کہوں کہ 'میں یہ سوچ رہا ہوں کہ تم بھارتی بغیر کولہوں کے اپنی کمر کے گرد پتلونیں کیسے لٹکا لیتے ہو؟' مگر پھر ذرا حوصلہ کر کے اس کی بات ہنسی میں اڑانے کی کوشش کی، یش کو بھارتی جیت

پر مبارک باد دی، دو چار اور رسمی باتیں کیں اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔
قریب ایک گھنٹہ بعد میرے موبائل پر اینا کا پیغام آیا:

"Yash n I goin to the Taj restaurant. Wanna dine out with us?"

میرے دماغ میں پہلے غلام علی کی غزل 'تمھارے خط میں نیا اک سلام کس کا تھا' آئی، پھر 'بیگانی شادی میں دیوانہ ناچے' کی ضرب المثل آئی۔ آخر میں یہ جواب آیا جو میں نے اسے لکھا:

"Good luck. I'm done eating. Goin to the bird's market with Jenny."

--☆--

کبھی کبھی منزہ سے کھیلنے کے لالچ میں، میں اپنے سے کئی ماہ چھوٹے مگر کئی گنا زیادہ شرارتی چچازاد بھائی علی کے ساتھ کھیلنے سے انکار کر دیتا تو علی مجھے بڑے اطمینان سے کہتا: "اچھا توئی بات نئیں، توئی بات نئیں، سلیم بھائی۔ میں نوشی تے ساتھ تھیلنے دا رہا ہوں۔" کبھی کبھار تو اس دھمکی میں آ کر میں اپنا فیصلہ بدل بھی لیتا تھا۔ تاہم چند برس بعد جب ہم ذرا بڑے ہوئے اور مجھے اپنے کزن کے گھر کے دوسری طرف رہنے والے تمام بچوں کی واقفیت ہونے لگی تو معلوم ہوا کہ پورے گاؤں میں نوشی نام کی کوئی بچی ہی نہیں ہے۔
"جھوٹے، جھوٹ بولتے ہو؟ توئی بات نئیں، نوشی تے پاس دا رہا ہوں۔ تو بن، میرا مطلب ہے کون ہے نوشی؟" ایک دن علی نے اپنی ننھی سی سینی کو چوڑا کر کے وہی پرانی دھمکی دی تو میں نے اس کے کان کو پکڑ لیا۔
"توئی نئیں توئی نئیں، سلیم بھائی میرا تان تھوڑیں، اوئی اوئی میرا تان تھوڑیں، آپ تو منزہ تی تسم، پلیز۔۔۔"

منزہ کا نام سنتے ہی مجھے ایک کرنٹ سا لگا۔

میں نے علی کا کان اس کے پلیز کہنے سے پہلے ہی چھوڑ دیا اور بہت سنجیدگی سے اپنی دس گیارہ برس کی شخصیت کو پراسس کرنے لگا۔ میں کون ہوں؟ کیا بننا چاہتا ہوں؟ بن کیا رہا ہوں؟ علی نے مجھے منزہ کی قسم کیوں دی؟ منزہ کے ساتھ کھیل کود میں، میں کہیں ضرورت سے زیادہ تو نہیں الجھ گیا؟ یہ سب میرے اس رویے سے تو نہیں ہوا کہ جس کی بہ دولت میں آئے دن محلے کے بچوں کی اس لیے پٹائی کر دیتا تھا کہ وہ منزہ سے بات کر رہے ہوتے۔ دو ایک کو تو صرف اس لیے تھپڑ پڑے کہ انھوں نے اسے گھور کر دیکھ لیا تھا۔ اور پھر ان سارے سالوں میں سب بچوں بڑوں کے آگے میں جتنی بھی بکواس کرتا رہتا تھا گھوم پھر کر منزہ پر ہی تو جا ٹھہرتی تھی۔ خیر اب کچھ عرصے سے میں نے اس کی تعریفوں کے پل باندھنا تو کچھ کم کر دیے تھے لیکن یہ جو آدھی چھٹی کے وقت دو قلفیاں لے کر گرلز اسکول کی طرف دوڑ لگا لیتا تھا؟ سب جانتے تھے کہ میری کوئی بہن نہیں ہے، پھر کس ماں کے لیے یہ سب کیا جاتا ہے؟ سب جانتے تھے۔ کیوں؟ یہ بھی سب جانتے تھے، سوائے میرے۔ میں ایسا کچھ جاننا بھی نہیں چاہتا تھا۔ نہ ہی مَیں ایسی شہرت کو افورڈ کر سکتا تھا۔

سو میں نے تہیہ کیا کہ آج کے بعد منزہ سے نہیں ملنا۔ ویسے بھی اب اس کی امی گاؤں کی باقی لڑکیوں کی طرح اس سے پردہ کرانے کا سوچ رہی تھیں۔ سو اچھا ہے۔ اور میرا مقصود تو تھا ہی محبت کو تلاشنا۔ سچی محبت کو، دور دیس کی جنس کو، امر ہو جانے والی محبت کو۔ لٰہذا ایک روتی ریت، پاگل سی، سانولی سی دیہاتی لڑکی کو اپنی راہ کی دیوار کیسے بننے دے سکتا تھا؟

--☆--

جب میں بہت چھوٹا سا تھا تو حکومت کی طرف سے میرے امی ابو کی ڈیوٹی لگائی گئی کہ گاؤں کے سب ناخواندہ بڑے بوڑھوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں۔ اس پروگرام کا نام ''تعلیمِ بالغاں'' رکھا گیا تھا۔ بالغوں کے نصاب میں جو کتاب سب سے زیادہ دل چسپ تھی اس کا عنوان تھا ''پاکستان کی لوک داستانوں کی ملکائیں۔'' بزرگ تو اس کتاب کو پڑھ کر دُرخانئ، سسی، ہیر اور

صاحباں وغیرہ پر بے حیائی کے فتوے لگا دیتے تھے، ہیر کے لیے ''کھلا ایس پیو کوں'' کہتے اور کیدو کو ''جوان دا پُتّر'' قرار دیتے مگر مجھے ان کہانیوں کو پڑھ کر بڑا مزہ آتا۔

کیچ مکران کے پنوں کی منزل بھنبھور تھی، تخت ہزارہ کے رانجھے کی منزل چناب کے اس پار شہرِ جھنگ میں تھی، تو میری محبت بھلا ہمارے بغل والے گھر کی سکینہ خالہ کی گود میں کیسے ہو سکتی تھی؟

سو مجھے ابھی طویل مسافتیں طے کرنی تھیں۔ ابھی تو میں نے اپنی اصل محبت کی اور ایک قدم بھی نہیں اٹھایا تھا۔ ابھی تو میں نے نمازِ محبت کا وضو ہی نہیں کیا تھا، محرابِ محبت کی سمت متعین نہیں کی تھی۔ ذکرِ محبت کا ورد عطا نہ ہوا تھا کہ ارد گرد کے یہ علی ٹائپ لوگ میری منزل کی اک عام سی بھولی بھالی سی صورت مجھ پر مسلط کرنے کے لیے تلے بیٹھے تھے۔

''آ وُ تو تبھی، دیکھو تو ذرا۔

ہم تیسے دِیے تیری تھا طر''

کان کو سہلاتے ہوئے علی مجھ سے ایک محفوظ فاصلے پر جا بیٹھا تو شرارتاً میری فکر مندی صورت کو آواز دینے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک تو اس کا صوتیاتی نظام مختصر سا تھا، دوسرا وہ اس قدر بے سُرا تھا کہ اس کے گانے پر مجھے ہنسی آ گئی اور میں بے قابو سا ہو کر کافی دیر تک ہنستا چلا گیا۔ میرے اس کھلکھلا کر ہنسنے نے علی کے شک پر سیمنٹ کا کام کیا اور یہ شک یقین میں بدل گیا۔

--☆--

جینی کے ساتھ برڈ مارکیٹ جانے کا یہ جھوٹا میسج جو میں نے کچھ دیر پہلے اینا کو کیا تھا بالکل اسی طرح کی دھمکی تھی جیسی مجھے علی دیا کرتا تھا۔ مگر چاہت کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں۔ اس میں فنا تو جائز ہے مگر انا کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ میسج بھیج بیٹھا تو احساس ہوا کہ اچھا تھا چلا جاتا۔ اینا میری وہ محبت تھی جسے میں نے سال ہا سال کی تلاش اور سات سمندر پار کی مسافت سے پایا تھا۔ اسی کی کھوج میں مَیں پہاڑی وادیوں، صحرائی نخلستانوں، سمندری جزیروں تک گیا۔

شادی بیاہ کی تقریبوں، میلوں ٹھیلوں، ادبی اور بے ادب کلبوں، کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں گیا۔ چناب کی منڑ پر بیٹھ کر ''میں نی جانڑاں کھیڑیاں دے نال'' گایا، انارکلی بازار میں جا کے کبوتر آزاد کیے، مارگلہ کے درختوں پر جب میرا نمل کا کلاس فیلو یکے بعد دیگرے ش، ک اور ع (شذرہ، کرن اور عالیہ کے لیے) لکھ کر تیر زدہ دل بنا رہا تھا تو میں نے وہی ایک حرف لکھا جسے میں بچپن سے لکھتا چلا آیا تھا: ''م'' یعنی محبت۔

میں اس کی تلاش میں یوں مارا مارا اس لیے پھر رہا تھا کہ مجھے یقین تھا کہ وہ ہے۔ دور کسی ویرانے میں عشق کی بُکل مارے، میرے نام کی تسبیح کرتی، مجھ سے چھپ کر، میری دیوانگی کی انتہا کی منتظر۔ میرا ہونا ہی اس کے ہونے کی سب سے بڑی دلیل تھا۔

اگرچہ میری وہی ''م''، میری محبت کا سراپا، میرے خوابوں کی رانی، بُکل تو کیا پوری پینٹ اور فُل سلیو شرٹ بھی خال خال ہی پہنتی تھی مگر کیا یہ کم خوشی کی بات تھی کہ وہ اس وقت مجھے کھانے کی دعوت دے رہی تھی اور کیا ہوا جو وہ لیش بھی ساتھ جا رہا تھا تو؟ اب سارے ہندوستانیوں سے تو دشمنی نہیں تھی میری۔ لیش کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ جاتا تو کون سا ملیریا ہو جانا تھا۔ رہا کرکٹ کا سوال تو یہ بھی کوئی دشمنی والی بات تھی بھلا؟ یکا یک حیرتوں کا ایک غول میرے دماغ پر آن اترا۔ میرے جیسا عالمگیریت پرست بھی قومیت کی رو میں بہ کر ایسا سوچ سکتا ہے؟ غالب کا مُرید بھی بازیچۂ اطفال کو میدانِ جنگ سمجھ سکتا ہے؟ کوئی فکر اور فلسفے کا دیوانہ تماشا گری کو تلخ حقائق کی فہرست میں ڈال سکتا ہے؟

--☆--

میرے نمل کے زمانے کے ہوسٹل کے مالک، خادم صاحب سرمایہ داریت کے بہت بڑے نقاد تھے۔ کہتے ''سلیم میاں، کہانیاں لکھتے لکھتے سرمایہ دار نہ بن جانا۔'' استفہاماً میں آنکھیں سکیڑتا تو کہتے ''سرمایہ دار سے بڑا تخلیق کار نہیں ہے اس جہان میں۔'' ایک بار وہ تیز چائے کی چسکی

لینے کو رُکے تو میں نے کہا'' کیسے؟''

وہ اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹے تھے، میں ان کے سامنے پڑی ایک پرانی کرسی میں بیٹھا تھا۔

''چائے ختم کرلوں پھر بتاتا ہوں۔''

خادم صاحب کی باتیں اتنی پُر مغز ہوتیں کہ دماغ کا مکمل جاگا ہوا ہونا ضروری ہوتا۔ سو میں نے بھی گرم کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگالیا۔

''سرمایہ دار'' انہوں نے اپنا کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''پہلے ایک خلل بنا کر تمہارے دماغ میں ڈالتا ہے۔ تم اس خلل کو لے کے پاگل ہونے لگتے ہو تو وہ اس کا علاج بنا ڈالتا ہے اور تم قطاریں بنا کر اسے خریدنا شروع کر دیتے ہو، اسٹاک کر لیتے ہو۔''

میں نے ایک جمائی لی اور اکتا کے کہا'' چھوڑیں خادم صاحب۔ میں نے بھی بہت مضمون پڑھے ہیں کہ بیماریاں ویکسینیں بیچنے کے لیے بنائی جاتی ہیں، وغیرہ۔ سب نام نہاد سازش دانوں کے اوہام ہیں۔''

''بیماریوں کو چھوڑو۔ بین الاقوامی کھیلوں کو دیکھ لو۔''

''ان میں کیا برائی ہے؟'' میں نے کرسی سے اٹھ کر اپنا کپ خادم صاحب کی سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

''بہت زیادہ برائی ہے۔ پہلے وطنیت کا خلل بنایا۔ جب تم قومی ترانوں کے خمار میں جھومنے لگے، تو کھیل بنا ڈالے۔ جیت کا خلل بنا ڈالا اور جب تم جیت کی امید لے کر ٹی وی کے آگے جا بیٹھے تو اس نے آپ کی ٹیم پر پردہ ڈالا اور تمہارے آگے پیپسی رکھ دی۔ اور بار بار رکھی۔ کبھی کسی دل رُبا سے چہرے سے منت کروائی تو کبھی کسی کھلاڑی سے۔ تم تو بیٹھے ہی خمارِ وطنیت میں تھے۔ سو اپنا لسی شربت بھول کر پیپسی کے کریٹ پر کریٹ منگوانے لگے۔''

''مگر خادم صاحب، کھیل، جیسے کہ کرکٹ، بہ چیزِ خود تو ایک اچھی چیز ہے نا۔ تفریح کے لیے، اور۔۔۔'' میں بیچ میں ٹپکا، اپنا فلسفہ جوڑنے کی کوشش کی مگر بات بن نہ پائی۔

’’یہ جو دماغ ہے نا‘‘ انہوں نے میرے سر کو پکڑ کے کہا ’’استعمال کرنے سے ایسے بنتا ہے جیسے وزن اٹھانے سے پٹھے بنتے ہیں۔ لیکن تم کبھی کبھی کوئی ایسی بات کر دیتے ہو کہ مجھے حیرت ہوتی ہے۔۔۔ کھیل کھیلنے کے لیے اچھی چیز ہے۔ مگر کرکٹ جیسے بین الاقوامی کھیل تو وہ اسکیل ہیں جن پر تم سرمایہ داریت کی قوت کو ماپ سکتے ہو۔ وہی خلل بل کہ ایک جال جس میں تم سب پھنس جاتے ہو۔ جب تک میچ جاری رہتا ہے مخالف ٹیم اور ملک سے نفرت کرتے ہو مگر جوں ہی ہارتے ہو اپنی ٹیم اور کھلاڑیوں سے نفرت کرنے لگتے ہو۔‘‘

’’یہ تو خیر وقتی احساسات ہوتے ہیں، خادم صاحب۔‘‘

’’او، ہو۔۔۔ مقصد بات کرنے کا یہ ہے کہ کرکٹ کی جنگ جھوٹ ہے، سچ نہیں۔ کھلاڑیوں کے بُت تراشے گئے ہیں، اتارے نہیں گئے۔‘‘

مجھے کچھ خاص متاثر ہوتا نہ دیکھ کر خادم صاحب بستر پر بے چینی سے اٹھتے لیٹتے رہے۔ ایسے موقعوں پر وہ اکثر مجھے کہہ دیتے تھے ’اچھا ابھی جاؤ مجھے آرام کرنا ہے‘، مگر آج وہ ہار ماننے کو تیار نہیں تھے۔

’’کیا تمہیں اس بات میں کوئی سانحہ نظر نہیں آتا کہ کچھ میٹرک فیل ایک ڈنڈے کی مدد سے چمڑے کے ایک گول ٹکڑے کو پیٹ رہے ہوں اور کروڑوں لوگ اس عمل کو اس قدر معنی خیز سمجھتے ہوں کہ اپنی زندگی کی ساری معنویت کو بھول بیٹھیں؟ اپنے آپ کو بھول بیٹھیں؟ عُشاق عشق کو معطل کر بیٹھیں، فاقہ کش بھوک کو؟ بیمار دوائی کو، روگی ہرجائی کو؟ پھر ہار نام کی بناوٹی چیز پر اپنے ٹی وی توڑ ڈالیں، بچوں کو پیٹ ڈالیں؟ کیا تمہیں یہ المیہ نہیں لگتا کہ تمہارے جیسا پڑھا لکھا شخص ایک اَن پڑھ بلے باز کا لایعنی انٹرویو سننے کے لیے ٹی وی کے آگے اُلو بنا بیٹھا ہو؟ کیا تمہیں اس بات پر کوئی زیاں نظر نہیں آتا کہ پانچ پانچ سو شاعر ایک ڈنڈے باز کا آٹوگراف لینے کے لیے قطار بنائے کھڑے ہوں؟ کبھی اس دماغ کو استعمال کیا ہے؟‘‘

انہوں نے ایک بار پھر میری کھوپڑی سے چھیڑ کی۔

’’کبھی سوچا ہے کہ اس اکڑ اکڑ کر آٹوگراف دینے والے کے پیچھے اگر سرمایہ دار نہ ہو تو اس کا کیا

بنے؟ کبھی سوچا ہے کہ اگر یہ سارا کھیل مشروبات اور کریمیں بیچنے کا نہ ہو تو اس میٹرک فیل کا کیا بنے؟ اسے گلیاں صاف کرنے کے لیے چوہڑا بھی کوئی نہ رکھے۔‘‘

خادم صاحب نے شدید غصے میں آ کر کہا۔

--☆--

اس وقت میں ان کی باتوں سے کوئی زیادہ قائل نہ ہوا تھا۔ بل کہ سچ پوچھیں تو مجھے یہ لگا تھا کہ خادم صاحب یہ ساری باتیں اس لیے کر رہے تھے کیوں کہ وہ خود کرکٹر نہیں بن پائے اور مکان کے کرائے پہ پلنے والے چارپائی زدہ فلسفی بن گئے مگر آج مجھے ان کی بات حرف حرف سچی لگی۔ کھیل جنگ کا مترادف نہیں ہو سکتے۔ مجھے لیش کو اپنا دشمن نہیں سمجھنا چاہیے۔ اینا کے ساتھ چلے جانا چاہیے تھا۔ خیر اب بے وقت کی روپِٹ سے کیا حاصل؟

کچھ لمحے بے دھیانی کے آئے اور میرے خیال کے شہر سے خادم صاحب اور ان کے فلسفے کی بساط لپیٹ گئے۔ میں بھولنے لگا کہ میری فکر ترقی کر کے مجھے پرائمری سکول کے دیے ہوئے قومی تعصّبات سے بالا ہو گئی ہے۔

ہمیشہ کی طرح میری کیفیت ایک بار پھر بدلی۔ غیرت نے پھر پھن نکالا۔ آہستہ آہستہ لیش پر غصہ آنے لگا۔ اس کا چہرہ میرے دماغ میں گھل مل کر باقاعدہ طور پر امریش پوری بننے لگا اور ولن تو فلم میں بھی آ جائے برداشت نہیں ہوتا، یہ خبیث تو میرے سینے پر مُونگ دل رہا تھا۔ میں اٹھا، اور کمرے میں ادھر ادھر دیکھ کر کوئی وزنی چیز ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ وہاں کچھ نہ ملا تو غصے میں چیزوں کو اٹھا اٹھا کر پھینکنے لگا۔ کتابیں پھینکیں، گلاس توڑا، ایک جراب اچھالی۔ پھر پیپسی کے ایک خالی کین کو زمین پر پٹخا تو وہ لیپ ٹاپ کی اسکرین سے جا ٹکرایا۔ بس میرا غصہ وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔ ایک انگڑائی لی اور بستر پر لُگڑوں لیٹ گیا۔ فکر سے میرا دماغ اب بھی پھٹ رہا تھا۔ اس ڈپریشن سے نجات پانے کے لیے میں کارنر روم میں چلا گیا اور وہاں پہنچ کر بیٹھنے ہی کو تھا کہ جینی آ گئی۔

"یہ جو دماغ ہے نا" انہوں نے میرے سر کو پکڑ کے کہا "استعمال کرنے سے ایسے بنتا ہے جیسے وزن اٹھانے سے پٹھے بنتے ہیں۔ لیکن تم کبھی کبھی کوئی ایسی بات کر دیتے ہو کہ مجھے حیرت ہوتی ہے۔۔۔ کھیل کھیلنے کے لیے اچھی چیز ہے۔ مگر کرکٹ جیسے بین الاقوامی کھیل تو وہ اسکیل ہیں جن پر تم سرمایہ داریت کی قوت کو ماپ سکتے ہو۔ وہی خلل بل کہ ایک جال جس میں تم سب پھنس جاتے ہو۔ جب تک میچ جاری رہتا ہے مخالف ٹیم اور ملک سے نفرت کرتے ہو مگر جوں ہی ہارتے ہو اپنی ٹیم اور کھلاڑیوں سے نفرت کرنے لگتے ہو۔"

"یہ تو خیر وقتی احساسات ہوتے ہیں، خادم صاحب۔"

"او، ہو۔۔۔ مقصد بات کرنے کا یہ ہے کہ کرکٹ کی جنگ جھوٹ ہے، سچ نہیں۔ کھلاڑیوں کے بُت تراشے گئے ہیں، اتارے نہیں گئے۔"

مجھے کچھ خاص متاثر ہوتا نہ دیکھ کر خادم صاحب بستر پر بے چینی سے اٹھتے لیٹتے رہے۔ ایسے موقعوں پر وہ اکثر مجھے کہہ دیتے تھے 'اچھا ابھی جاؤ مجھے آرام کرنا ہے'، مگر آج وہ ہار ماننے کو تیار نہیں تھے۔

"کیا تمہیں اس بات میں کوئی سانحہ نظر نہیں آتا کہ کچھ میٹرک فیل ایک ڈنڈے کی مدد سے چمڑے کے ایک گول ٹکڑے کو پیٹ رہے ہوں اور کروڑوں لوگ اس عمل کو اس قدر معنی خیز سمجھتے ہوں کہ اپنی زندگی کی ساری معنویت کو بھول بیٹھیں؟ اپنے آپ کو بھول بیٹھیں؟ عُشاق عشق کو معطل کر بیٹھیں، فاقہ کش بھوک کو؟ بیمار دوائی کو، روگی ہرجائی کو؟ پھر ہار نام کی بناوٹی چیز پر اپنے ٹی وی توڑ ڈالیں، بچوں کو پیٹ ڈالیں؟ کیا تمہیں یہ المیہ نہیں لگتا کہ تمہارے جیسا پڑھا لکھا شخص ایک اَن پڑھ بلے باز کا لایعنی انٹرویو سننے کے لیے ٹی وی کے آگے اُلو بنا بیٹھا ہو؟ کیا تمہیں اس بات پر کوئی زیاں نظر نہیں آتا کہ پانچ پانچ سو شاعر ایک ڈنڈے باز کا آٹوگراف لینے کے لیے قطار بنائے کھڑے ہوں؟ کبھی اس دماغ کو استعمال کیا ہے؟"

انہوں نے ایک بار پھر میری کھوپڑی سے چھیڑ کی۔

"کبھی سوچا ہے کہ اس اکڑ اکڑ کر آٹوگراف دینے والے کے پیچھے اگر سرمایہ دار نہ ہو تو اس کا کیا

بنے؟ کبھی سوچا ہے کہ اگر یہ سارا کھیل مشروبات اور کریمیں بیچنے کا نہ ہو تو اس میٹرک فیل کا کیا بنے؟ اسے گلیاں صاف کرنے کے لیے چوہڑا بھی کوئی نہ رکھے۔"

خادم صاحب نے شدید غصے میں آ کر کہا۔

--☆--

اس وقت میں ان کی باتوں سے کوئی زیادہ قائل نہ ہوا تھا۔ بل کہ سچ پوچھیں تو مجھے یہ لگا تھا کہ خادم صاحب یہ ساری باتیں اس لیے کر رہے تھے کیوں کہ وہ خود کرکٹر نہیں بن پائے اور مکان کے کرائے پہ پلنے والے چارپائی زدہ فلسفی بن گئے مگر آج مجھے ان کی بات حرف حرف سچی لگی۔ کھیل جنگ کا مترادف نہیں ہو سکتے۔ مجھے لیش کو اپنا دشمن نہیں سمجھنا چاہیے۔ اینا کے ساتھ چلے جانا چاہیے تھا۔ خیر اب بے وقت کی روپٹ سے کیا حاصل؟

کچھ لمحے بے دھیانی کے آئے اور میرے خیال کے شہر سے خادم صاحب اور ان کے فلسفے کی بساط لپیٹ گئے۔ میں بھولنے لگا کہ میری فکر ترقی کر کے مجھے پرائمری سکول کے دیے ہوئے قومی تعصبات سے بالا ہو گئی ہے۔

ہمیشہ کی طرح میری کیفیت ایک بار پھر بدلی۔ غیرت نے پھر پھن نکالا۔ آہستہ آہستہ لیش پر غصہ آنے لگا۔ اس کا چہرہ میرے دماغ میں گھل مل کر باقاعدہ طور پر امریش پوری بننے لگا اور ولن تو فلم میں بھی آ جائے برداشت نہیں ہوتا، یہ خبیث تو میرے سینے پر مُونگ دل رہا تھا۔ میں اٹھا، اور کمرے میں ادھر ادھر دیکھ کر کوئی وزنی چیز ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ وہاں کچھ نہ ملا تو غصے میں چیزوں کو اٹھا اٹھا کر پھینکنے لگا۔ کتابیں پھینکیں، گلاس توڑا، ایک جراب اچھالی۔ پھر پیپسی کے ایک خالی کین کو زمین پر پٹخا تو وہ لیپ ٹاپ کی اسکرین سے جا ٹکرایا۔ بس میرا غصہ وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔ ایک انگڑائی لی اور بستر پر لگڑوں لیٹ گیا۔ فکر سے میرا دماغ اب بھی پھٹ رہا تھا۔ اس ڈپریشن سے نجات پانے کے لیے میں کارنر روم میں چلا گیا اور وہاں پہنچ کر بیٹھنے ہی کو تھا کہ جینی آ گئی۔

"Where have you been, Jenny?"

میں نے خوشی اور شکایت کے گڈمڈ انداز میں "جینی تم کہاں مرگئی تھی" کا شریفانہ سا ترجمہ کرتے ہوئے پوچھا:

"What? I mean, when?"

جینی نے اس غیر متوقع سوال پر خوشگوارانہ سی حیرت سے جوابی سوال کیا۔

"All through the afternoon and in the evening?"

"In the afternoon ... I ... guess ... I was ... with a handsome guy ... in the dining hall."

جینی نے مسکرا کر کہا اور اس سے پہلے کہ مجھے اپنے سوال اور بھلکڑ پن پر ندامت ہوتی، وہ بولی:

"But in the eveing, I was searching for Sasa's partner. Online."

"I see. Did you find any?"

"Almost yes. Booked a female Sasa. Will go to the store tomorrow."

"You mind if I go with you?"

میں اتنا سستا تو کبھی بھی نہیں تھا مگر ساتھ جانے کی یہ پیش کش میں نے اینا کو کیے گئے جھوٹے پیغام کو کچھ یوں سچا کرنے کے لیے کی جیسے ہمارے ملک کے لیڈر بلیک منی کو وائٹ کرتے ہیں۔

"Seriously, Saleem?"

"Yep."

"Thank you, thank you, thank you sooooo much."

جینی نے آگے بڑھ کر اظہارِ تشکر کے لیے مجھے گلے لگالیا۔

ابھی جینی کی تشکر آمیز بانہیں میرے گلے کا ہار ہی تھیں کہ اینا اور لیش کار نر روم میں آ گئے۔ جینی کی تو دروازے کی طرف پشت تھی مگر ان گناہ گار آنکھوں نے دیکھا کہ اینا آگے تھی اور اس کے عقب میں اس کا بایاں ہاتھ تھا جس میں اس نے لیش کا دایاں ہاتھ تھام رکھا تھا۔ عین اس وقت جب میری نظریں اینا کی حیران آنکھوں سے ملیں، دنیا و مافیہا سے بے خبر جینی نے میری پیشانی کا بوسہ لے کر میری محبت کا بیڑا غرق کر دیا۔ میرے منہ سے برجستہ ایک ٹھیٹھ سرائیکی جملہ نکلا: "دھاڑ وئے۔"

اینا فوراً پلٹی، لیش اپنے ملک کے گائڈڈ میزائل 'اگنی' کی طرح اس کے پیچھے ہی گھوم گیا۔ میں نے جینی کو آہستہ سے یوں پیچھے کیا جیسے نرم نان وربل پنجابی میں کہا ہو "پچھاں مَر۔"

میں جب جیبوں کو ٹٹول کر موبائل تلاش کر رہا تھا تو جینی نے پوچھا:

"Was it Anna?"

وہ اس کے قدموں کی چاپ یا شاید میرے ماتھے کی شکن سے اندازہ لگا چکی تھی۔

"Yes, Jenny."

میں نے شکستہ لہجے میں کہا۔

"I am sorry, Saleem. I'll explain it to her."

اس نے کہا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

"You were fine, Jenny. No worries."

میں نے اس کے پیچھے کہا مگر وہ بغیر جواب دیے چلی گئی۔

"I hope you won't misunderstand me, Anna."

میں نے اینا کو پہلا میسج کیا۔

"It's not what you might be thinking."

میرا دوسرا میسج۔

"I am sorry."

تیسرا۔

"Where? Wanna see you immediately."

چوتھا۔

"I love you, Anna."

پانچواں۔

"Hey!!!"

چھٹا۔

ساتواں۔

آٹھواں۔ ":-*: ;-*: ;-*"

اینا جس نے ہمیشہ میرے میسج کا جواب بلا کی سی تیزی سے دیا تھا آج لگتا تھا۔۔۔مرگئی ہے۔ اسے کہتے ہیں 'اپنا شہتیر بھی نہ نظر آئے اور دوسرے کی آنکھ کا تنکا بھی کھٹکے۔' میں نے اپنی سی کوشش کر بیٹھنے کے بعد سوچا۔

--☆--

﴿۹﴾

میری چھٹیوں کی چھٹی شام کو اینا نے میرے شانے پہ سر رکھا تو ہم دونوں جانتے تھے کہ ہم ایک دوسرے سے کوسوں دور بیٹھے ہیں۔ پانچ پکی اور چھٹی افسانوی حس کے علاوہ عورت کی ایک ساتویں حس بھی ہوتی ہے: حسِ محبت۔ اسی حس نے مرغ بادنما بن کر اینا کو بادِ محبت کا بدلتا رخ محسوس کرا دیا تھا اور رہا میں تو مجھے یہ دیکھنے کے لیے کسی حسِ اضافی کی ضرورت ہی کب تھی کہ اینا کا دل بٹ چکا۔ مگر ایسا کیوں کر ہوا یہ میں جاننا تو ضرور چاہتا تھا پر پوچھ کر نہیں۔

کچھ ہی دیر میں اینا اور ریٹش نے بولڈر شہر کے ایک انتہائی مہنگے اور مشہور کلب میں جانا تھا۔ وہ بس لڑکوں کے کامن باتھ رومز سے لیش کے نہا دھو کر آنے کا انتظار کر رہی تھی۔

کارنر روم میں میرے کندھے پر اپنا سر رکھ کر۔

بہت دیر تک خاموشی ہم دونوں کے ایک دوسرے سے بچھڑنے کا ماتم کرتی رہی۔ فطرتاً میری خاموشی زیادہ گہری تھی۔ سنگلیوں کے ماتم جیسی گہری۔ کیوں کہ اینا سے بچھڑ کر میں تو اس کی ہی ایک خوب صورت دوست کے پاس جا رہا تھا مگر مجھے اینا کو دشمن ملک کے 'منہ نہ متھا' قسم کے لیش کے حوالے کرنا پڑ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد اینا مجھ پر شکایت زنی کرنے لگی۔ کہا کہ میں اسے اب بھی بہت اچھا لگتا ہوں مگر بدقسمتی سے میں اس کی ٹائپ کا نہیں ہوں۔ نہ تو میں اسے سینما لے جاتا ہوں، نہ باہر کھانے پر، نہ کسی کلب میں۔ نہ اسے کوئی تحفہ لے کر دیتا ہوں اور نہ ہی اس پر ایک دھیلا خرچ

کرتا ہوں۔ کہا کہ میں نے اسے اپنے ماضی کی تفصیلات بتائیں اور نہ ہی مستقبل کی منصوبہ بندی۔ اس نے مجھے باور کرایا کہ خالی رومان سے چاہے وہ لاکھوں سے بہتر کیوں نہ ہو، اینا جیسی خوب صورت لڑکی کو نہیں لبھایا جا سکتا۔ خیر میری باقی خامیوں کو تو وہ نظر انداز کر دیتی مگر اس جینی کا کیا کیا جائے جسے وہ خود اپنی آنکھوں سے میرے ساتھ چپکے دیکھ چکی تھی۔ اس نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ مجھے اس کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ خوش قسمتی سے اس کے پاس لیش تھا پڑا جو اس کا بڑی اچھی طرح خیال رکھ سکتا تھا۔

اب میں اسے کیا سمجھاتا کہ اینا ان بھارتیوں کو خوب صورت چیزوں کی کوئی قدر نہیں ہے اگر ہوتی تو آج کشمیر کا یہ حال نہ ہوتا۔ میرے پاس اور بھی بہت ساری باتیں تھیں، دلائل تھے، وعدے تھے، کھانے وغیرہ کھلانے اور فلمیں وغیرہ دکھانے کے لیے پیسے تھے، کلچر کو ایڈجسٹ کرنے کے لیے لچک تھی مگر میں نے کچھ نہ کہا۔ اینا کی آنکھوں میں سوال تڑپتے رہے، بلکتے رہے، پر میں چپ رہا۔ اس کے کان میرے لبوں کے ہلنے کے منتظر رہے۔ میں راہِ محبت کا وہ خاموش مسافر تھا جس کی ڈاچی کے گلے ٹلیاں نہ تھیں۔ میرے ایقان کے مطابق سفر منزل کی پکار سے کٹتا تھا۔ دلائل دینے، وعدے کرنے یا ٹکے خرچنے سے نہیں۔ یہ کام زندگی میں نہ میں نے کبھی کیے تھے، نہ کرنے کا ارادہ تھا۔ منزل کی پکار کے باوجود بھی میں کبھی اس کے زینے تک جانے کا قائل نہ تھا۔ اپنی آمد کی خبر خوش بو کے ہاتھ بھجواتا اور پھر منزل کے قدمچے خود چل کر فصیلِ شہر تک استقبال کو آئیں تو ٹھیک ورنہ میں ایک بھی شب کا پڑاؤ ڈالے بغیر پیار کے اگلے شہر کی راہ لیتا۔ یہی تو وجہ تھی کہ مجھے پہلی بار ایک منزل نما بھی دس ہزار میل دور جا کر نصیب ہوئی اور کیا اس روز میں اینا سے کچھ دور ٹھہر نہ گیا تھا؟ اگرچہ اینا اسے میرا مشرقی حجاب تصور کرتی تھی مگر دراصل یہ احترامِ محبت تھا۔ یوں محبت کو بن چادر کے جا لینا ہماری روایت نہ تھی۔ محبّ کے اس اہتمام کی لاج محبوب بہ پیش ہو کر رکھنا ہوتی ہے۔ ایسا ہی تو ہوا تھا سب کچھ۔

مگر کیا سچی محبت گیارہویں وکٹ کی طرح اتنی ناپائیدار ہوتی ہے کہ اسے ایک ایسے

ملک کا لڑکا آ کر گرا دے جس نے آج تک کوئی ڈھنگ کا باؤلر ہی پیدا نہیں کیا؟

اپنی اس عجیب و غریب منطق پر میں مسکرایا تو جانے اینا کو کیا سوجھی کہ لب دراز کر کے میرے مسکراتے چہرے کا بوسہ لے لیا۔ اسی دوران لیش کارنر روم میں داخل ہو چکا تھا اور اینا کی بے تکلفی کا خوب نظارہ کر چکا تھا۔ مگر مجال ہے کہ ذرا برابر بھی ٹھٹکا ہو۔ کسی بلند درجے کا بے غیرت بن کر "You ready, Anna?" کہا اور اگلے ہی لمحے اگنی میزائل بن کر اس کے پیچھے ہو لیا۔ وہ چلے گئے تو میں نے تین چار انتہائی واہیات گالیوں کو جو دماغ میں جمنے لگی تھیں، لیش کے نام پر تھوکا اور اس آس پر کہ بھارت فائنل میں ہار گیا ہوگا، کرکٹ پر اپ ڈیٹس دیکھنے کے لیے لیپ ٹاپ کھولا۔ لیپ ٹاپ کی سکرین پر روشنی پھیلتے ہی فیس بک کھل گیا اور میرے سامنے کوئی آٹھ سیکنڈ کی ایک ویڈیو آئی جس کا کیپشن تھا:

"Yash carving my name on water." گرتے دل کو سنبھالنے کے لیے میں کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور لیپ ٹاپ پر جھکتے ہوئے کرسر کو پلے کے نشان پر لے جا کر لیفٹ کلک کر دیا۔ ویڈیو میں اینا لکھا تو کہیں نظر نہ آیا مگر لیش نے پانی پر دو بار 'اے' اور دو بار 'این' بنانے کی کوشش ضرور کی۔ 'کاش' میں نے سوچا 'میں اینا کو بتا پاتا کہ اس کا نام سوئمنگ پول کے گندے پانی پر نہیں، دل پر لکھنے کے لائق ہے اور دل پر لیش نے نہیں میں نے لکھا ہے۔' مگر اینا شاید دل کی ویڈیو مانگتی جو میرے پاس نہ تھی۔ یقیناً میرا دعویٰ اس کے امریکی حقیقت پسندی کے پیمانے پر پورا نہ اترتا۔ اسے میری دلیلوں کی سمجھ ہی نہ آتی اور جس بات کا معلوم ہو کہ اگلا نہیں سمجھے گا اُسے صَرف ہی نہیں کرتے۔

میں نیوز فیڈ میں آگے بڑھا تو علی کے ایک لائف ایونٹ پر نظر پڑی:

"In a relationship."

نیچے کمنٹس میں لوگ اس سے طرح طرح کے سوال پوچھ کر اسے بے عزت کر رہے تھے:

"کس کے نصیب پھوٹے ہیں؟"

''لڑکی کا نام کیا ہے؟''

''ولدیت ہی بتا دو؟''

''بھابھی کا نمبر مل سکتا ہے؟''

''اپنے گاؤں میں تو کوئی اتنا پاگل نہیں ہو سکتا کہ اپنے ہاتھوں سے بیٹی وار دے؟''

''یہ کون ہے عہدِ جاہلیت کا عرب جو اپنی بیٹی کو زندہ درگور کرنے پر تل گیا ہے؟''

کچھ لوگوں کے لیے فیس بک اگر بندر کے ہاتھ کا استرا نہیں تو گنجے کے ہاتھ کا ناخن ضرور ہے۔ ایک سہ حرفی پوسٹ کر کے علی نے بیٹھے بٹھائے کاٹھ گڑھ کے بلوچوں کی دھوتی اٹھوا دی۔

تاہم علی مکمل طور پر دَڑ وَٹ کے بیٹھا تھا۔ ایسا خاموش کہ لگتا تھا فیس بک کے برقی جہان سے کُوچ کر گیا ہو۔ دراصل اس کی بے عزتی کی خوراک کے چمچ اس وقت تک پورے ہی نہیں ہوتے تھے جب تک مجھ سے گالیاں نہ کھا لیتا۔ اور پھر اس کی یہ رشتے والی چھیڑ تو تھی ہی میرے ساتھ۔ برسوں پہلے جب سے میں نے منزہ کا باب بند کیا تھا وہ مجھے اُس کے حوالے سے مسلسل چڑاتا رہتا تھا۔ اس بے وقوف کے دماغ میں کہیں سے یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ میں منزہ کو کبھی نہیں بھول پاؤں گا اور میری تمام زندگی میں اگر کوئی کبھی مجھے چھیڑنا چاہے گا تو اس کے لیے منزہ کا نام لے لینا یا محض اس کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہوگا۔

اسی لیے خبیث کبھی مجھے میسج بھیجتا کہ 'اُس' کا نمبر ڈھونڈا ہے، کبھی کہتا کہ 'اُس' سے دس دس گھنٹے چیٹنگ چل رہی ہے۔ ظاہر ہے میں ان بچپنے کی باتوں سے بہت آگے نکل گیا تھا۔ لہٰذا ان پر طیش میں آنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے تو بس علی کے اس بچپنے پہ غصہ آتا تھا جو اس کے ساتھ ہی بڑا ہوتا آ رہا تھا۔

ایک بار میں بچپن کے کسی خوب صورت خیال کو اپنے وقت کا دانہ چگوانے میں مست

بیٹھا تھا کہ اچانک علی کی کال آ گئی جو میں نے فوراً وصول کر لی: ''اُس سے مل کر آیا ہوں، سلیم بھائی۔ ڈی جی خان میں۔ ڈیٹ ٹائپ۔'' علی نے اپنے پاؤں پہ تیز دھار واہیاتی مارتے ہوئے کہا۔

کاش کہ میں اپنا جواب یہاں لکھ پاتا۔ کاش کہ میں آپ کو بتا پاتا کہ اینا کے اس مشرقی حجاب پوش نے اُس دن علی کی تواضع پاکستانی زبانوں کے کن کن الفاظ سے کی۔ کاش کہ میں آج یہاں وہ نحو لکھ سکتا جس نے اس روز میرے اُن خاص لفظوں کو ترتیب کیا تھا۔ لیکن ایسا ممکن نہیں ہے، کیوں کہ اس روز جو زبان علی کے لیے استعمال ہوئی تھی وہ آپ قارئین تو کیا، اس دنیا کو سیکڑوں گالیاں دَین کرنے والے میرے تایا ابو بھی سن لیتے تو باقی کی عمر کانوں پر وہ کھوپے چڑھائے رکھتے جو ابو جی اپنے گھڑ دوڑ میں حصہ لینے والے گھوڑوں کو چڑھاتے تھے۔ بس یوں سمجھ لیں کہ کوئی پندرہ بیس منٹ کے لیے میرا منہ گالیوں کا خودکار ہتھیار بن گیا۔ میں نے علی کو اتنی گالیاں دیں کہ کولوراڈو سے کاٹھ گڑھ تک گالیوں کا ایک گرینڈ بازار لگ گیا۔ ایسی ایسی گالیاں کہ جن کی نایاب صوتی لہروں کو اٹلانٹک کے پانیوں نے اٹھ اٹھ کر اور یورپ کے اوباشوں نے رُک رُک کر دیکھا ہو گا۔ حالاں کہ مجھے پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہ تھی کیوں کہ مجھے معلوم تھا کہ منزہ علی جیسے کن ٹٹوں کو کبھی منہ نہیں لگانے والی۔ خیر اس دن کے بعد علی کو کال اور میسج کی جرأت تو کبھی نہ ہوئی مگر فیس بک کی آڑ میں کافی کچھ کہہ جاتا۔ چاہتا تو میں اسے بلاک کر دیتا مگر وہ گاؤں کی خیر خیریت جاننے کا بھی ایک ذریعہ تھا۔ منزہ کے حوالے سے تو اس کی معلومات بس اتنی سی تھیں کہ سکینہ خالہ اور منزہ کے ابو جی منزہ کے دادا سے لڑ کر ڈی جی خان جا بسے تھے۔

فیس بک کی روشن گلیوں میں آوارہ گردی کرتے کرتے جب دو تین گھنٹے گزر گئے تو میں نے لیپ ٹاپ بند کیا اور ذرا تازہ ہوا میں سانس لینے کے لیے کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ دور سڑک پر ایک نوجوان جوڑا ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ہاسٹل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مجھے ان کے

ستاروں کی رُومان پسندی پہ رشک آنے لگا۔ ابھی ان کی خوشی کو اپنے من پہ طاری ہی کر رہا تھا کہ وہ بدن سے لپٹا بدن ہاسٹل کے مین گیٹ کی روشنی کے نیچے آ گیا۔ ان کے دھندلے نقش واضح ہوئے تو میری آنکھیں ماند پڑ گئیں۔

اینا بہت تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی۔

''جینی'' میں نے فوراً ٹائپ کیا اور جب میسج بھیج بیٹھا تو اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ یہ کیا میسج تھا۔ نہ کوئی سوال، نہ خبر، نہ سلام، نہ دعا۔ جانے اب جینی اس سے کیا مطلب نکالے گی۔

فوراً ہی موبائل کی ٹون بجی۔

"Saleeeeeeeeem!"

جیسے وہ میرے اسی میسج کا صدیوں سے انتظار کر رہی ہو......اور جیسے اسے میرے ہاتھوں اس کا نام لکھنا احسانِ عظیم لگا ہو۔ جیسے اسے اس اہم نکتے کا ادراک ہو کہ کسی کا نام لکھنا کس قدر پیارا عمل ہوتا ہے۔ اس نے بھی اینا کی پانی والی ویڈیو دیکھ لی تھی کیا؟

"How is Sasa?"

میں نے فصیلِ محبت سے باہر پڑاؤ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"He's waiting for you to fullfil your promise."

میں کافی دیر تک موبائل سکرین کو گھورتا رہا۔ میرا اشتیاق وہی تھا جو نئی محبت کے مکتوب کو پڑھنے والے کا ہوتا ہے۔ بہت دیر تک میں نے جواب نہ لکھا۔ اب کی بار میں ہر قدم پھونک پھونک کے اٹھانا چاہتا تھا۔ جینی کی جگہ اینا ہوتی تو اب تک دس sms آ چکے ہوتے۔ مجھے اپنی طرف گھسیٹ کے لے جا چکی ہوتی مگر جینی سفرِ محبت میں جلد باز نہ تھی۔ شاید جانتی تھی کہ محبت سفر ہی سفر ہے۔ بالآخر میں نے تین لفظ لکھے اور برقی اچھال کی مدد سے جینی کی جھولی میں ڈال دیے:

"In corner room."

ایسے موقعے پر اینا دوڑی دوڑی آیا کرتی تھی اور میری سانسوں کی رفتار دھیمی پڑنے

سے پہلے پہلے میرے پہلو میں آ بیٹھتی تھی مگر حسبِ توقع جینی نے آنے میں دیر کر دی۔ میرے پڑاؤ کا سمے کنارے لگ چکا تو میں اٹھ کر اپنے کمرے میں سونے چلا آیا اور پھر اس کے قدموں کی چاپ سن کر بھی لیٹا رہا اور اسے الٹے پاؤں واپس جاتے سن کر بھی۔

--☆--

﴿۱۰﴾

میں اگلے دن اپنے تئیں صبح سویرے ہی اٹھ گیا۔ ساڑھے نو بجے مجھے نوم چومسکی کے دوست کے ''پاکستان میں امریکا کے ڈرون حملے'' پر سیمی نار میں شرکت کرنے پہنچنا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ سیمی نار میرے لیے کوئی زیادہ معلومات افزا نہیں ہوگا مگر ہاسٹل میں بیٹھ کر ساسا کو خارش کرنے سے تو بہتر تھا کہ امریکیوں پر اپنی بھڑاس ہی نکال آتا جو اب اینا کے لیش سے جا ملنے کے بعد تو میری صحت کے لیے بہت ضروری تھا۔

ساری پُھرتی کے باوجود میں جب ہال میں پہنچا تو سیمی نار شروع ہو چکا تھا۔ مقرر کوئی پچاس پچپن برس کا پست قامت گورا تھا۔ اس نے پہلے اپنی ایک دوست کی لکھی ہوئی نظم پڑھی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ پاکستان کے غریب بچے جو ہمارے لیے ٹوپیاں بنا کر اور شالیں بُن کر بھیجتے ہیں ہم ان کے لیے ڈورن بھجواتے ہیں اور یہ کہ پاکستان کے وہ نوجوان جو ہمیں گلاب کے پھول بھیجتے ہیں ہم انھیں ڈرون کا تحفہ دیتے ہیں اور پاکستان کے وہ بزرگ جو ہمیں دعائیں دیتے ہیں، ہم ان کی پھیلی ہتھیلیوں پر ڈرون کی آگ رکھ دیتے ہیں۔ نظم پر انہیں خوب داد ملی۔ میرے لیے یہ امر حوصلہ افزا تھا کہ عام امریکی اپنے ملک کی جنگی پالیسیوں کے خلاف ہے۔

نظم کے بعد اس نے کہا:

''خواتین وحضرات، ان ڈرون حملوں میں پاکستان کے غریب بچے مر رہے ہیں۔ میں معذرت چاہتا ہوں مگر مجھے ایک مرتبہ پھر کہنے دیجیے، ہم لاکھوں ڈالر لگا کر پھول سے چہروں والے بچے مار

رہے ہیں۔ ہم جنہیں ان بچوں کو مسکراہٹوں کے تحفے بھیجنے چاہیے تھے، موت کے پروانے بھیجتے ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ امریکا کے حکمتِ عملی ساز اداروں میں انسان نہیں شیطان بھرتی ہوتے ہیں۔ حاضرین میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میرے اور آپ کے پیسوں سے بھیجے گئے ان ڈرونوں میں مارے جانے والے نوے فی صد لوگوں کو امریکا کا نام تک معلوم نہیں۔ نہ ہی انھیں یہ معلوم ہے کہ جنگیں کیوں ہوتی ہیں۔ اگر آپ میں سے بھی کسی کے ذہن میں یہی سوال ہو تو میں آپ کو بتاتا چلوں کہ جنگوں کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے اور وہ ہے مال بنانا۔ چاہے وہ گن اور گولی بیچ کر بنایا جائے یا مالِ غنیمت لوٹ کر سرمایہ داریت کا حصہ بنایا جائے۔

بھائیو! یہ جنگ یک طرفہ ہے۔ بہت ہی غیر متناسب۔ ۹/۱۱ کے بعد سے اب تک دہشت گردوں نے تو امریکا کے صرف پانچ فوجی مارے ہیں مگر امریکا مسلمان ملکوں میں کم از کم پانچ لاکھ لوگوں کو براہ راست یا بالواسطہ رزقِ خاک کر چکا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس ظلم کا حساب ہماری اگلی نسلوں کو چکانا پڑ جائے۔

کیا ہم سب کا فرض نہیں بنتا کہ ہم ان ڈرون حملوں کو روکنے کے لیے اپنا احتجاج ریکارڈ کرائیں تاکہ آنے والی نسلوں کو اور ساری دنیا کے امن پسند لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ اس غیر انسانی طرز کی جنگ میں ہم شامل نہیں تھے کہ سچے امریکی ظلم کی اس داستان کے راقم گزاروں کی صف میں نہیں کھڑے تھے۔''

اس پر ہال میں موجود تمام لوگوں نے تالیاں پیٹ کر اپنے آپ کو داستانِ جبر کے مقدمے سے بری کرا لیا۔ ان کی گونج مدھم ہوئی تو میں نے ہاتھ اٹھا کر مائک مانگا اور اس کے دستیاب ہوتے ہی کہا: ''میرا نام سلیم ہے اور میرا تعلق اسی ملک سے ہے جہاں آپ کے یہ ڈرون نامی انگارے اترتے ہیں......''

"Here we go! See, this is the strength of the truth! Reaches out to the affectees. Our heartiest

condolences for the casualities, for your loss. Please give it up for the Pack-is-tainee gentleman here!"

ان صاحب نے انتہائی جذباتی انداز میں مجھے خوش آمدید کہا۔ ہال میں بیٹھے تمام لوگوں نے تالیاں بجائیں۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا، سینے پر ہاتھ رکھ کر سب کا شکریہ ادا کیا اور پھر ایک غیر متعلق سا سوال کر ڈالا:

''مجھے خوشی ہے کہ آپ نے میرے ملک کے لوگوں پر ہونے والے ڈرون حملوں کی مذمت کی۔ مگر مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اب شاید بہت دیر ہو چکی ہے۔ تاہم آپ جیسی باخبر شخصیت کی موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آج کل شام میں کیا ہو رہا ہے؟ میں نے سنا ہے وہاں کی بے چینی میں بھی امریکی پالیسیوں کا عمل دخل ہے؟ بہ حیثیت امریکی پالیسیوں کے نقاد کے آپ کیا کہنا چاہیں گے؟''

نوم چومسکی کے دوست اپنے ہاتھ مَلنے لگے۔ ''آپ کی تشریف آوری کا شکریہ اور سوال پوچھنے کا بھی۔ مگر میں ابھی شام کی صورتِ حال کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ سرِ دست آپ پاکستان میں ڈرون حملوں پر سوال کر سکتے ہیں۔''

میرے بائیں طرف ایک ہندوستانی صاحب بیٹھے تھے، میرے کان میں کہنے لگے:

''سب پتا ان کو پر سالے تب تک شام کی بات نئیں کرنے والے جب تک وہاں کی سٹوریاں نیویارک ٹائمز میں نہیں چھپ جاتیں۔''

''آپ کشمیر سے ہیں؟''

''میں اتر پردیش سے، سر۔''

''آپ کے باپ دادا ہجرت کر کے گئے تھے پاکستان سے؟''

''نئیں نئیں، سر۔'' اس کے بھگوانوں کو کیا خبر کہ میں کن وہموں کا مارا ہوں اور یہ سوال کیوں داغ رہا ہوں۔ وہ میرے سوالوں پر کنفیوز ہوا جا رہا تھا اور میں اس کے منہ سے کام کی بات سن کے شک کے

مارے کہ نگوڑا کہتا کچھ ہے اور بولتا کچھ۔ بتاتا خود کو انڈین ہے، بُو الائچی کی دیتا ہے۔ خیر اُجلی اُجلی اداکاراؤں کے علاوہ وہ پہلا بھارتی تھا جو مجھے اچھا لگا۔

--☆--

میں واپس ہاسٹل پہنچا تو جینی ساسا کو لے کر ڈائننگ ہال میں خالد بھائی سے روزوں کی کوئی بات کر رہی تھی۔ چوں کہ جینی اور خالد دونوں کی میری طرف پیٹھ تھی۔ میں انہیں لفٹ کرائے بغیر ڈائنگ ہال کے دونوں دروازوں کے سامنے سے راہداری میں آگے موجود اپنے کمرے کی طرف بڑھتا گیا مگر کسی طرح ساسا کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے والہانہ پر پھڑ پھڑائے اور ''ٹی ٹی ٹریٹ، ٹی ٹی ٹریٹ'' کرنے لگا۔

"I guess Saleem is back."

جینی کی آواز آئی۔

'دھاڑ وئے۔' میں نے تیز قدم اٹھاتے ہوئے خود کلامی کی۔

"Hey, Saleem. Sasa was saying 'hi'."

میں نے پلٹ کر دیکھا تو جینی ہال اور راہ داری کے درمیان والے دروازے پر ساسا کو لیے ہاتھ ہلا رہی تھی۔ میں نے ہاتھ ہلا کر انتہائی روکھے لہجے میں ''ہائے ساسا'' بولا اور اپنے کمرے میں گھس گیا۔

جینی ایک اچھی لڑکی اور قابلِ محبت دوست تھی۔ اس کی آنکھوں میں حیا تھی۔ نسوانی ہچکچاہٹ تھی، عورت پن تھا، دھیرج اور دِھرتا تھا۔ اس لیے اس نے ساسا کی اوٹ لی ہوئی تھی۔ مگر اس کی یہ نرم خرامی اور آہستگی زچ کر دینے والی بھی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ اس قدر چالاکی سے ساسا کو استعمال کرتی کہ مجھے ساسا اور خود پر ترس آنے لگتا۔

اپنے کمرے میں آ کر میں واش روم میں گھس گیا۔ کموڈ پر بیٹھتے ہی ایک جمبو سائز جمائی لی۔ سامنے آئینے میں خود کو سست دیکھا تو مجھے اس رات ساسا کا مدہوش ہونا یاد آیا، اس کی سستی کے

پوز یاد آئے۔۔۔

اگلے لمحے میں نے خود کو مسکراتے پایا۔

کسی حد تک وہ سچی بھی تھی۔ ساسا واقعی مجھے مِس کرتا تھا۔ میرا منتظر رہتا تھا۔ مجھے دیکھ کر چہک اٹھتا تھا۔ 'ہائے' بولتا تھا۔ میرے ساتھ اپنا ننھا سا آپ پیوست کر بیٹھا تھا۔۔۔ مجھے احساسِ جرم سا ہونے لگا۔ مجھے اس روکھے پن کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مجھے ساسا کے احساسات کا پاس رکھنا چاہیے۔ اس کو وقت دینا چاہیے۔ یوں اپنی ذمہ داریوں سے نہیں بھاگنا چاہیے۔ معلوم نہیں بے چارہ کیا سوچ رہا ہوگا۔

اور ابھی چند منٹ پہلے ہی میں جینی کو کوس رہا تھا کہ ساسا کو استعمال کرتی ہے۔

میں کموڈ سے اٹھا۔ ہاتھ وغیرہ دھوئے، ٹراؤزر پہنی، واش روم سے نکلا، شرٹ بدلی، اور تیز تیز چلتا ہوا ڈائننگ ہال میں آیا۔ ساسا میز پر پڑے اپنے ساسا زہاؤس میں بیٹھا قیام وطعام کر رہا تھا۔ جینی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں خاموش قدم اٹھاتا ساسا کے سر پر جا کھڑا ہوا۔ وہ میری آمد سے بے خبر دانہ چگنے میں مگن تھا کہ میں نے سرگوشی کے انداز میں کہا: ''ساسا۔''

سرگوشی زدہ ہو کے ساسا نے سر اٹھایا اور اگلے ہی لمحے حیرت زدہ ہو گیا، جیسے اس کی زندگی میں کوئی بہت بڑا چمتکار ہو گیا ہو۔ جیسے اسے پرندوں کی دنیا کا باراک اوباما مان لیا گیا ہو۔ ''ٹی ٹی ٹریٹ''، ''ٹی ٹی ٹریٹ''، ''ٹی ٹی ٹریٹ''۔ اس نے ساسا زہاؤس سے باہر نکلنے کی ضد کی۔

میں نے ہنستے ہوئے اسے باہر نکالا اور اپنے ہاتھ پر بٹھا کر اس کے سر کو چوم لیا۔ عین اسی وقت جینی سامنے کچن سے بھاگتی ہوئی آئی۔ لہلہاتے ہوئے لمبے پیلے سنہرے بال اس کے پیچھے پیچھے آئے۔ جس انرجی سے وہ آ رہی تھی مجھے لگا کہ پاس آ کر میرے گلے لگے گی۔ سو میں نے خود کو مضبوطی سے فرش پر لنگر انداز کر لیا۔ مگر یہ شاید میرے اندازے سے زیادہ میری حسرت تھی۔ قریب آ کر وہ رُکی، مسکرائی اور آہستہ سے کہا:

"Oh! Oh! Somebody's being caring."

"I AM caring."

میں نے تصحیح کی۔

"We know that...Sasa and I know that Saleem is caring... And loving too."

اس نے جواباً کہا اور مجھے بیٹھنے کو کہے بغیر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ شاید جینی کی طلب اتنی ہی تھی۔ کسی کو اپنے اردگرد دیکھنے کی یا شاید وہ جانتی تھی کہ میں اس کے پاس بیٹھنے ہی آیا ہوں۔ میں اس کے بالمقابل پڑی ہوئی ایک کرسی پر جا بیٹھا۔ جینی سامنے رکھے ساسا کے گھروندے کو یوں غور سے دیکھنے لگی جیسے یہ کوئی جادو کا ڈِبا ہو جسے چھو لینے سے کوئی بھی معجزاتی چیز واقع ہو سکے۔

"What are you looking at, Jenny?"

"Nothing."

جینی نے میری آنکھوں کے سامنے سے اپنی کمان جیسی پلکیں اوپر اٹھائیں، سبز آنکھوں کی گہرائی کو وا کیا اور ابھی میرا جی بھرا نہ تھا کہ ڈھانپ لی۔ میں مضمونِ محبت کے پیرائے میں جینی کی اس ادا کی تاثیر پر غور کر رہا تھا کہ ساسا نے میرے انگوٹھے پر ٹِکا کے ایک عدد ٹھونگا مارا۔

''او تیری بہن کی......کتی کے......''

میرے منہ میں اچانک گاؤں کی زبان دَر آئی۔ میں نے یہ گالیاں اتنی اونچی آواز میں دیں کہ جینی کی چھرکی نکل گئی، جب کہ ساسا صاحب کی پُو۔

جینی نے میرے گندے ہاتھ کو دیکھا تو ہنسنے لگی... اور ہنسی تو متعدی ہوتی ہے سو میرے ہونٹوں سے بھی پھوٹ پڑی۔ ساسا اب میرے ہاتھ سے اتر کر سامنے میز پہ منہ بسورے بیٹھا تھا۔ میں نے ہاتھ صاف کیے اور اسے واپس اٹھا لیا۔

"Here, come back. I'm sorry."

میں نے اسے دوبارہ دانہ کھلانا شروع کر دیا۔

"By the way, what happened, Saleem? Why did you yell at Sasa?"

جینی نے پوچھا:

"Sasa bit me for talking to you?"

"Sasa wants attention."

جینی نے مسکرا کر کہا اور اپنی پیشانی کو اپنے دائیں ہاتھ کی پشت پر یوں رکھا کہ اس کے سنہرے بال ڈھلک ڈھلک کر اس کے چہرے کا نقاب بننے لگے۔

"We need to quickly find him a life partner."

جینی نے آہستہ سے کہا۔

یہ انگلی دے کر پورا ہاتھ چبوانے کے مترادف تھا۔ میں نے ساسا کی تیمارداری کیا کی کہ اب وہ کیلے کا چھلکا بن کر چپک ہی گیا۔ اب اس کی شادی بیاہ کی ذمہ داری بھی مجھ پر آن پڑی تھی۔

--☆--

ایک ہی کام تھا جسے میرے گاؤں والے خصوصی دل چسپی سے کرتے تھے اور وہ تھا تیمارداری۔ یہ کام وہ اتنے ذوق وشوق کے ساتھ کرتے تھے کہ اکثر اوقات خود بیمار کے فرشتوں کو اپنی بیماری کا علم نہیں ہوتا تھا اور تیماردار طرح طرح پھکیاں تہبند کے ڈبیک میں باندھ کر لے آتے اور آتے ساتھ پوچھتے: ''پتر سنا ہے کہ تیرے دشمنوں کو مورقہ ہو گیا ہے؟''

آپ لاکھ کہیں کہ سر میں درد ہے۔ وہ آپ کو سر درد کی بنیادی وجہ قرآن وحدیث سے ثابت کر کے پیٹ کی وہ بیماری بتاتے جو نہ صرف سر درد کا باعث تھی بل کہ ڈھائی سو سال پہلے اس پھکی کی ایجاد کا بھی۔

اگر بالفرض مریض منزہ کے دادا یا ان کی طرح کا کوئی جدید طرز کا آدمی ہوتا تو پھکی کی

بجائے 7-UP منگوائی جاتی۔ پلانے والا اسے گلاس میں ڈال کر جلدی جلدی مریض کے منہ سے چپکا دیتا اور پھر دو تین لوگ تاکید کرتے کہ بلبلوں کو منہ میں نہ پھٹنے دینا، منہ میں نہ پھٹنے دینا۔ یہی بلبلے ہی تو ہیں جو سر کی گیس کو جذب کر کے ڈکار دیتے ہیں۔

کوئی کسی دم کرنے والے کو لے آتا اور اس سے ڈسپرین دم کرا کے کھلا دی جاتی۔ کوئی دلیہ لے آتا، کوئی مکھن کا پیڑا پرچ میں رکھ لاتا، کوئی پیسے لا دیتا اور جو کوئی خالی ہاتھ آتا، آتے ساتھ ہی مریض کو دبانا شروع کر دیتا۔ مریض کو تکلیف معدے کی ہو یا مثانے کی دبانے والے کے ہاتھ میں ہمیشہ ٹانگیں ہی آتیں۔ کچھ تیماردار اس بزرگ کی کہانی سناتے جو سر درد کے وقت دیوار کو ٹکریں مار رہا تھا کہ دیوار چلنے لگ گئی تھی اور اس وقت تک نہ رکی جب تک بزرگ نے دوسری طرف جا کر زور کی ٹکر نہ ماری۔ پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ دیوار تو رک گئی مگر بزرگ اللہ میاں کی طرف رواں دواں ہو گئے۔ جس ثروت مند آدمی کی دیوار تھی وہ آگے والے غریب کے گھر کی زمین پہ یوں پکا ہو گیا، جیسے مولوی امان اللہ بشکو نائی کی بیوی شادی پہ۔

بڑی بوڑھی عورتیں آ آ کے دعائیں دیتیں اور وقفے میں اس شخص کا واقعہ بتاتیں جسے ہلکا سا سر درد ہوا اور منہ کے بل زمین کو جا لگا اور اسی وقت اللہ سائیں کو پیارا ہو گیا۔ یہ کہانی سن کر مریض کو ایک تسلی آمیز خیال ضرور آتا کہ کچھ بھی ہو میں کسی کو پیارا نہیں ہو سکتا۔

لگے ہاتھوں مریض کے بکرے یا دیہڑے کو لا کر اس پر مریض کا ہاتھ بھی پھروالیا جاتا کہ صدقہ کرنے میں کوئی تاخیر نہ ہو۔ چڑھوئے کو بلا لیا جاتا کہ خیرات کے لیے دیگ پکا دے۔ دار چینی کی خوشبو غدود ولعاب کو سہلاتی تو گاؤں کے بچے وہیں بنٹوں سے ٹک پل کھیلنے آ جاتے۔ گدھا تانگری والا اپنا ٹھیا لگا لیتا، ''فروٹ والا'' چار چار آنے کی گاجریں بیچنے لگتا۔ وہیں کہیں سے بشکو نائی بھی آ نکلتا۔ جو بچے بنٹے ہار چکے ہوتے بشکو کے آگے سر اڑ دیتے کہ چلو اور نہیں تو سر کی خارش تو مرے۔ بشکو استرا پھیرتا جاتا اور بچوں کا دماغ بھی چاٹتا جاتا:

''امان ڈبویں وے امان، اتنی جوئیں!! میرا بس چلے تو ایک ایک کو لتر ماروں۔ تم سب کے

سروں پر گُوتے توڑوں۔ یہ سب کراڑ نسل کی ہیں۔ جن مسلمان ہوسکتا ہے۔ جانور مسلمان ہوسکتا ہے۔ پر بُوں کی ذات کراڑ ہی ہوتی ہے۔ پکی کافر۔"

کافر سے کسی بزرگ کو پوتے کا تہور یاد آجاتا اور وہ بشکو کو اُس کی بیوی شادی کی شرم گاہوں پر عربی و دیسی نسلوں کے گھوڑے دواڑانے کی دھمکی دے کر وہیں انتظار کرنے کا حکم دیتا اور ایک ایک تھوک میں تین تین سو گرام نسوار اگلتا گھر کو جاتا۔ بچے کی دادی کو گالیاں بکتا (جسے وہ یہ سمجھ کر نظر انداز کر دیتی کہ دراصل یہ گالیاں بہو کے لیے ہیں) اور اسے اچک کر لے آتا۔ بچہ بغلیں اچکا اچکا کر دادا کے کندھے پر سوار ہو جاتا۔ اس کے فرشتوں کو بھی نہیں خبر کہ کیا ہونے والا ہے اور اُس وقت تک نہ ہوتی جب تک چڑیا اُڑ نہ چکی ہوتی۔

گویا ایک میلے کا سماں بندھ جاتا۔ آس پاس کے گھروں کی بالکنیں آنکھوں میں سُرمہ لگا کر اور دانتوں پر مُساگ رگڑ کر دیواروں کے پیچھے پڑی اینٹوں پہ چڑھ آتیں کہ مستقبل کے ممکنہ دُلہے کو ذرا دیکھیں تو سہی کہ موئے کی موچھیں نکلیں یا ابھی تک کھودے کا کھودا ہے؟

حیران کن بات یہ تھی کہ تمام خطرناک تجربوں کے باوجود مریض جلد ہی رُو بہ صحت ہونے لگتا۔ یوں پھکی والے کا پھکی پر اور دم والے کا دم پر یقین پختہ سے پختہ تر ہو جاتا۔

خیر ایسا بھی نہ تھا کہ گاؤں میں جب بھی کوئی بیمار ہوتا ہمیشہ صحت یاب ہی ہوتا۔ مگر مرتے تو صرف وہ لوگ تھے جن کی کھُٹ چکی ہوتی تھی اور جن کے دن پورے ہو جائیں، انھیں پھکیوں والے تو کجا، خود خضر بھی پوچھنے آئیں تو بچ نہیں پاتے۔

--☆--

گاؤں کے پاس ہی مشرق میں ابو جی نے اپنے مویشیوں کا ایک بھانہ بنایا ہوا تھا جس کا انتظام رمظی نام کا نوجوان سنبھالتا تھا۔ سب اسے رمظی کا بھانہ کہتے تھے۔ اس کا قد تو صرف ڈھائی تین فٹ تھا مگر اس کی تیز دماغی اور بہادری کے قصے اس قدر مشہور تھے کہ گاؤں میں بچے بڑے جو بھی اِس کا ذکر کرتے لفظ حرامی کا لاحقہ لگانا نہ بھولتے۔ ایک رات اسی بھانے میں چور آ

دھمکے۔ اس رات مویشیوں کی حفاظت کے لیے بھانے میں رمظی اکیلا تھا۔

چوروں نے کام کے جانوروں کو ان کے کِلوں سے کھولا اور انھیں باڑے سے باہر ہانکنے لگے۔ ادھر رمظی کی ایک آنکھ کھل چکی تھی، جسم پہ کپکپی طاری ہو چکی تھی، وضو بھی خطا ہو چکا تھا اور ایسی حالت میں دعا مانگنا تو مناسب نہ تھا مگر وہ خواہش ضرور کر رہا تھا کہ چوروں کی نظر اس پر نہ پڑے۔ مگر شومئ قسمت کہ بچھڑوں نے ماؤں کو بچھڑتے دیکھا تو اُچھل کود کر شور مچانے لگے۔ رمظی نے کروٹ لے کر خود کو منہ کے بل چارپائی سے یوں گرایا کہ اندھیرے میں چوروں کو یہ لگا ہوگا کہ کوئی بچھڑا اچھل کر گرا ہے۔ پھر پیٹ کے بل رینگتا گوبر عبور کرتا اُس بچھڑے کے سر پہ جا پہنچا جو سب بچھڑوں کو ڈرا ڈرا کر ان کا پیشاب نکلوائے جا رہا تھا اور وہ سب مل کر چوروں کو اپنی طرف متوجہ کیے جا رہے تھے۔ رمظی نے اس کی گردن دبوچ لی اور منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ مگر بچھڑے نے پوری قوت سے یوں بے ترتیبی اچھل کود کی کہ رسی کے دو بل رمظی کی ناک اور گردن پر کس گئے۔ ایک لمحے کو تو اس نے کلمہ بھر چھوڑا۔ پھر اچانک رسی یوں ہٹی کہ اس کے منہ سے پھنسی چیخ زناٹے بھرتی باہر نکلی اور جاتے ہوئے چوروں کے مستعد کانوں سے ٹکرائی۔ وہ بپھر کر واپس پلٹے۔ مگر داد ہے رمظی کے جحم اور پھرتی کو کہ چھلانگ لگا کر ایک روشن دان میں سے باڑے کے پچھواڑے نکل آیا اور اس سے پہلے کے چور پورا باڑا گھوم کر پچھواڑے کی طرف آتے اور رمظی ان کی گولی کا لقمہ بنتا، وہ مُٹھیاں پھونک کر گاؤں کی طرف بھاگنے لگا۔ کچھ دیر متذبذب ہونے اور تعاقب کا راستہ ڈھونڈنے کے بعد چور بھی اس کے پیچھے بھاگے تا کہ رمظی کے منہ سے واردات کی خبر نوچ سکیں۔

گاؤں کی چوڑی گلی میں پہنچ کر رمظی نے چور چور کہنا شروع کر دیا۔ پھر ڈاکو، ڈاکو بھی کہا۔ مگر حرام ہے جو کسی نے گھر سے سر بھی نکالا ہو۔ رمظی ایک پتھر سے ٹکرا کر گرا، خرگوش کی سی پھرتی سے اٹھا اور پھر دوڑنے لگا۔ اسی سے اس کے دماغ میں ایک خیال آیا اور وہ زور زور سے وہ کہنے لگا جسے گاؤں والے نیند کے عالم میں بھی وضاحت سے سن سکتے تھے:

"او میرے پیٹ میں درد ہے۔ دھاڑ وئے، میرا پیٹ پھٹ رہا ہے۔ او، دھاڑ وئے کسی کے پاس

کوئی پھکی ہے تو لے آؤ۔ او میں مر رہا ہوں۔ میرا پیٹ مجھے کھائے جا رہا ہے۔"

دیکھتے ہی دیکھتے کوئی سوڈیڑھ سو گاؤں والے اپنی تہبندیں سیدھی کرتے، مختلف مقاماتِ جلی و خفی کو کھجلاتے، حقے کی چلم کو ٹھپکارتے، آنکھیں ملتے، معدے کا غبار، حوالۂ ہوا کرتے، نیند میں گھلی ملی آوازوں میں رمظی کی ماں بہن ایک کرتے باہر نکل آئے۔ تب رمظی نے انھیں بتایا کہ پیٹ کا درد تو ابھی پتھر سے ٹکرا کر گرنے سے ہوا۔ اصل واقعہ باڑے میں چوروں کے گھس آنے کا تھا۔

یوں تیمارداری کے واسطے نہ صرف اس کی جان بچی بل کہ ہمارے مویشی بھی بچ گئے۔

--☆--

﴿11﴾

میں اور جینی شام کو پرندوں کے بازار گئے اور ساسا کے لیے ایک پیاری سی مادہ ساسا ڈھونڈ لائے۔ جس کا نام میں نے ساسی رکھا اور جینی کے استفہام پر اسے سمجھایا کہ اردو گرامر کی رو سے ساسا کی بیوی کو ساسی کہا جانا چاہیے۔ جس پر جینی نے فوراً ہی طے کیا کہ وہ اسے ساسی ہی کہا کرے گی۔

مجھے جینی پر ذرا پیار سا آیا اور اسی رو میں بہہ کر یا شاید تحت الشعور میں اینا کے طعنے کی موجودگی کی وجہ سے واپسی پر میں جینی کو انڈین ریستوران "تاج" پر ڈنر کرانے لے گیا۔

وہاں ہم سے کھانے کا آرڈر لینے کے لیے کسی ویٹرس کے بجائے مشرق کا حسنِ مجسم آ گیا۔

دمکتا ہوا چہرہ، گول گول گال اور ان میں لبوں کی ہر جنبش پہ بنتی مِٹتی ہلکوریاں، جھیل جیسی گہری آنکھوں میں جلتے بجھتے دُرِ سیاہ، خم دار گیسوؤں کی لہکتی تاب داری، دُودھیا دانتوں پہ اجلی اجلی کاشی کاری۔ لب تھے کہ صادقین کا کینوس! کسی فن کارِ محبت نے ہلکے گلابی رنگ کی تر و تازہ پنکھڑیوں پہ پیمانۂ عشق رکھ کر، کلکِ جنوں کو رنگِ محبت کی قندِ گل میں ڈبو کر ایسی ظالم لکیریں کھینچیں کہ بات بات پہ دودھیا دانت ان کا بوسہ لے لیتے۔ میں جو ایک مدت سے اینا اور جینی جیسی دوشیزاؤں کے سفید کاغذی بدن کی شان میں قصیدے کہہ رہا تھا، اس سانولی سلونی سے ہار مان بیٹھا۔

اس خوب صورت ویٹرس سے راہ و رسم باندھنے کی خاطر میں بڑے سے ایل ای ڈی پر

لگی شاہ رخ خان کی فلم کی تعریف کرنے لگا۔ ایسے موقعوں پر میں اوپر نیچے ڈھیر ساری باتیں کرنے لگتا ہوں۔ کیا معلوم اسے ان میں سے ایک آدھی بھلی لگ جائے۔ میں نے اسے بتایا کہ ''دل والے دلہنیا لے جائیں گے'' میں کاجل بہت cute لگ رہی ہے۔ ویٹرس کو ذرا دلچسپی لیتے دیکھ کر میں نے کاجل کی مسکراہٹ، اس کی آواز، اس کی چال ڈھال وغیرہ پر ایک لمبی سی بکواس کر ڈالی جسے سننے کے بعد وہ مجھے چھیڑتے ہوئے بولی: ''سر وہ تو خیراب پرانی ہوگئی ہیں، کوئی نئی پسند کریں نا، اپنی جنریشن کی، اپنے دور کی۔''

''نئی، ہاں نئی میں سب، سب کی سب پرفیکٹ ہیں۔ سوناکشی کی فریشنس، کترینا کی معصومیت، پریانکا کی گفتار، پرینیتی کی آواز، انوشکا کے ایکسپریشنز، اور وہ عاشقی ٹو والی شردھا، مجھے وہ بھی پسند ہے۔'' سوچا، جتنی دماغ میں آئیں سب کا نام لے لوں، کچھ معلوم نہیں کس پہ رام ہو جائے۔

میری اس تقریر میں معلوم نہیں کیا خاص بات تھی کہ وہ اک عجب مست مسکراہٹ کو اپنے ہونٹوں کا زیور بنائے کھڑی تھی۔ یہ مسکراہٹ طنزیہ نہ تھی جو اس طرح کی بونگیوں پہ در آتی ہے بل کہ اس میں اُنس، لگن اور اپنا پن تھا۔

''مگر مجھے آپ کے ملک کے کرکٹر نہیں پسند۔'' میں نے ذرا اکڑتے ہوئے کہا۔

''کس کے ملک کے، سر؟'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''میں تو پاکستانی ہوں۔۔۔''

بندہ چاہے کتنا ہی cute کیوں نہ ہو ایسے مواقع پر اس کا اپنی باچھوں پہ کنٹرول نہیں رہتا اور غدودِ لعاب کا رال پر۔

''میں بھی پاکستان سے ہوں۔ مجھے سلیم کہتے ہیں۔'' میں نے کرسی سے چھلانگ لگا کر اٹھتے ہوئے اس کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑنے کی کوشش کی مگر اس نے اپنے دائیں ہاتھ کو پیشانی پر رکھ کر جلدی سے ''میں مون ہوں۔ آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔'' کہہ دیا۔

''مجھے بہت خوشی ہوئی۔'' میں نے رسان سے کہا۔ کچھ دیر کے لیے جینی کے بندر رنگے بال میرے وطن کی مٹیار کی گھنی سیاہ زلفوں کے سائے میں دب گئے تھے۔ اچانک مجھے اس کا خیال آیا تو فوراً

اس کا تعارف کرانے لگا۔ ''جینی، اس سے ملو، یہ مون ہے، پاکستان سے ہے اور مجھے معلوم ہی نہیں کہ یہ یہاں ہے۔'' میری ضرورت سے زیادہ excitement پر جینی نے پہلی بار مجھے وہ والی زور کی گھوری دی جس پر نمل کی لڑکیاں ouch کہا کرتی تھیں۔ یوں میری کیفیت کا اینٹی کلائمیکس ہوا اور ہوش میں آتے ہی میں نے اس پاکستانی لڑکی سے جینی کا تعارف کروایا:

"Oh, sorry. This is Jenny. She is my girl friend. And this is Sasa, and this is his bride, Sasi."

اس کے بعد جب میں گرل فرینڈ والی بلّی پر غور کر رہا تھا تو مجھے دو تین مرتبہ ہائے، ہائے کی آواز آئی۔ پاکستانی لڑکی نے ہمیں اس کو معاف کرنے کو کہا اور چلی گئی۔

"I love her chocolatey skin."

جینی نے بات کا بتنگڑ نہ بناتے ہوئے اس کے سانولے پن کو سراہا۔

"And I went to the Choco Factory with that haramzadi Anna."

میں بڑبڑایا۔

جینی نے کھانا جلدی جلدی کھایا اور ختم کر کے پہلو بدلنے لگی۔ کبھی میری پلیٹ کو ماپتی، کبھی میرے ہاتھوں کو دیکھتی اور کبھی میری نظروں کے تعاقب میں اُس دروازے کو دیکھتی جہاں سے وہ ویٹر اندر گئی تھی۔ اس کی بے چینی پر ترس کھا کر بالآخر میں اٹھ گیا۔ تاہم ریستوران سے باہر نکلتے ہوئے میں نے ایک بار پلٹ کر پھر اس دروازے کی طرف دیکھا۔

اوں ہوں۔۔۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔

باہر نکل کر میں نے جینی کو ایک چھی دی اور پھر وہ اپنی سائیکل پر بیٹھ گئی اور میں اپنی پر۔

--☆--

ہاسٹل پہنچ کر جینی اپنے کمرے کی طرف گئی اور ساسا کے منہ پر ساسی کو مار کر سیدھی

میرے کمرے میں آ گئی۔ اندر آتے ہی وہ تشکر آمیز نظروں سے مسکرائی اور مجھے زور سے hug کرلیا۔
شکریہ ادا کرنے کے لیے:

کہ میں نے اس کے ساسا کو ساسی ڈھونڈ دی اور میری وجہ سے وہ عین اس وقت اپنی ازدواجی زندگی کا سنگ بنیاد رکھ رہا تھا۔

کہ میں نے جینی کو اس پاکستانی لڑکی سے اپنی گرل فرینڈ کے طور پر متعارف کروایا تھا۔

کہ میں اسے کھانا کھلانے لے گیا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

پھر وہ میرا پسندیدہ گانا "I feel you" گانے لگی۔ اس معاملے میں مَیں بھی کہاں پیچھے رہنے والا تھا۔ کالج کے زمانے میں طبلہ بجانا سیکھا تھا۔ لگے ہاتھوں میں وہی بجانے لگا۔

--☆--

رات گئے جب جینی میرے اور اپنے لیے کافی بنانے چلی گئی تو میں نے لیپ ٹاپ کھولا اور پہلی بار بسم اللہ پڑھ کر فیس بک پر "In a relationship" کے بٹن پر کلک کر دیا۔ وہ کافی لے کر آئی تو بہت ہی جذباتی لگ رہی تھی۔ میرے پہلو میں بیٹھ کر کہنے لگی:

"You know what, Saleem.......? You are an angel. My muse. The epitome of all my dreams."

اس طرح کی بہت ساری باتیں جو میں بھی ایک زمانے سے سوچتا آیا تھا، چھوٹے چھوٹے، ساسا ساسی جتنے، ننھے ننھے وقفے دے کر کہہ لینے کے بعد جینی چند دقیقوں کے لیے خاموش ہو گئی۔ اس کی

نظریں چھت پر اٹکی میری ایک جراب پر ٹکی تھیں، جسے میں نے اُس دن یش پر غصہ کھا کر اچھالا تھا اور آج تک ڈھونڈنے میں ناکام رہا تھا۔ ویسے ہی جیسے امریکا بہادر اپنے ہی اچھالے ہوئے اسامہ بن لادن کو ڈھونڈنے میں ناکام رہا تھا۔

اچانک جینی نے ایک سوال پوچھ ڈالا:

"سلیم، کہاں سے آئے ہیں آپ؟"

ایک لمحے کو تو مجھے اپنی طبلہ نوازی پہ شک ہوا کہ اناڑی پن کی وجہ سے کہیں الٹی سیدھی چوٹ لگا دی۔ جس سے بے چاری کی یاد جاتی رہی ہے۔ کیوں کہ جینی اچھی طرح جانتی تھی کہ میں اسلام آباد سے آیا ہوں اور میرے بچپن کا گھر ضلع ڈیرہ غازی خان کے ایک گاؤں کاٹھ گڑھ میں ہے۔

خیر وہ ابھی چھت کو ہی گھور رہی تھی کہ میں نے گوگل میپس پر بولڈر ٹو اسلام آباد سمت اور فاصلہ تلاش کیا۔ فوراً سے پہلے فیروزی رنگ کی ایک کمان بولڈر اور اسلام آباد کے بیچ ایک پُل کی سی صورت میں نمودار ہوئی اور خیال کے منکوں کو ماضی کے دھاگوں میں پرو کر مجھے میرے گاؤں لے گئی۔

--☆--

منزہ کی اپنے سکول کی ایک گوری سی لڑکی سے ہمیشہ لڑائی رہتی تھی۔

ایک روز بارش کی وجہ سے میں سکول نہ جا سکا۔ بارش رکی تو میں گھر کے باہر ندی کے پاس کھیلنے لگا اور منزہ کے سکول کی چھٹی کا انتظار کرنے لگا۔ گھنٹی بجتے ہی منزہ زاروقطار روتی میرے پاس آ گئی اور رو رو کر بتانے لگی کہ اُس لڑکی نے کہا ہے کہ ہماری حکومت سارے کالوں کو ایک جہاز میں بھر کر دوسرے سیارے پر بھیج رہی ہے اور چوں کہ منزہ کا شمار بھی کالی لڑکیوں میں ہوتا تھا، لہٰذا اس لڑکی نے نصیحت کر دی کہ وہ لڑائی جھگڑے کرنے کے بجائے یہاں سے روانہ ہونے کی تیاری پکڑے۔ اس نے اِسے یہ بھی بتایا کہ وہاں سے تم لوگ کبھی بھی واپس نہیں آ سکو گے۔

میرے جی میں آیا کہ اسے کہوں منزہ تم بھی پاگل ہو، اتنے سارے کالے ہیں یہاں،

ایک جہاز میں کیسے جائیں گے؟ تاہم میں نے کچھ نہ کہا۔

اس منزہ کی بچی میں کوئی خاص بات تو نہیں تھی مگر پھر بھی وہ کبھی روتی تھی تو میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگتا اور میری پلکیں بھی معمول سے کچھ زیادہ پھڑکتیں اور کبھی کبھی تو نم بھی ہو جاتیں۔

میں نے بچپنے کی کوئی انت منطق استعمال کرتے ہوئے کہا: ''منزہ دیکھو، اگر حکومت نے تم لوگوں کو بھیج دیا تو بھی کیا فرق پڑے گا۔ تم جدھر بھی ہوگی میں تو تم سے ملنے آؤں گا ہی آؤں گا۔ یہ تو میرا وعدہ ہے تم سے۔''

''جھوٹے! کیسے آؤ گے؟ وہ جہاز واپس تھوڑی آئے گا۔ اس کا پائلٹ بھی کالا ہوگا۔'' اس نے روتے ہوئے کہا۔

میں فکر میں پڑ گیا۔ آج تک بچپن کی رومانویت سے نہ نکل سکنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ بچپن کے مسائل بہت سادہ سے ہوتے ہیں اور ان کے حل بھی۔ لہٰذا فکر کرتے کرتے کوئی ہلکان نہیں ہو جاتا۔ میرے ہاتھ میں بارش کے پانی میں اتارنے کے لیے جو تیار کشتی تھی اسے میں نے کھول کر جہاز میں بدلا اور کہا:

''میں اپنا جہاز بنالوں گا اور اس میں بیٹھ کر آؤں گا۔ تم دیکھنا۔ جہاں بھی ہوگی ناں تم، میں وہیں پہنچ جاؤں گا۔''

میں نے اُس کاغذی جہاز کو ہوا میں اچھالا تو منزہ کی نظروں نے اس کی آزمائشی پرواز کا تعاقب کیا۔ اس کی نظر سامنے قوسِ قزح پر پڑی۔

''سلیم، تم اس پینگ پر بیٹھ کر مجھ سے ملنے آنا، اچھا؟''

اس نے فوراً اپنی ننھی سی انگلی دھنک کے پُل کی طرف کر کے کہا۔

''اچھا۔'' میں نے وعدے کے انداز میں سر کو ہلا کر کہا۔ ''اب آؤ کھیلتے ہیں۔''

مگر منزہ کی آنکھ کے آنسو ابھی خشک نہ ہوئے تھے کہ دور سے اس کے دادا کی گرج دار

آواز ہمارے کھیل کا فرشتۂ اجل بن کر آئی: ''منزہ ہہہہہہہہ۔''

''جی آئی دادا ابو جی۔''

اس کے دادا واپس پلٹ گئے۔ اس نے مجھ پر پانی ڈالنے کی اپنی سب سے پسندیدہ شرارت پوری کی اور اپنے گھر کو بھاگ گئی۔ میں دیر تک گیلے کپڑوں کو سکھانے کے لیے وہیں گلی میں ندی کے پاس ٹہلتا رہا کیوں کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ ایک بار پھر منزہ کی شرارت کی سزا میری امی علی کو دیں۔

--☆--

جینی نے گوگل میپس کی نیلی کمان پر بولڈر سے اسلام آباد تک ہاتھ پھیرا اور آہستہ سے کہا: ''وہاں چلتے ہیں۔''

وہ اٹلانٹک کے اِس پار آنا چاہتی تھی۔

'محبت!' میں نے سوچا۔ 'عجب گُتھی ہو تم، جسے سلجھانے کے لیے میں دس ہزار میل دور یہاں آیا ہوں اور جینی تمھارے پیچھے وہاں جانا چاہتی ہے۔۔۔'

وہاں، جہاں میں نے نفرتوں کی تبلیغ سنی تھی اور محبتوں پر پابندیاں دیکھی تھیں۔ جہاں لوگ ناخداؤں کی جگہ عبادت گاہیں اڑانے والے دور میں جا پہنچے ہیں۔ جہاں مسلمان تو ایک کو بھی نہ کیا گیا مگر کافر و مشرک سب کو کر ڈالا گیا۔

میں نے کہا کہ جینی کو بتاؤں کہ جینی جس مقام پر اس وقت تمھاری انگلی ہے ناں، وہاں میرا دل ہے مگر یہ ارضِ پاک ابھی پاک ہونے کے عمل سے گزر رہی ہے۔ میرا ملک حالتِ جنگ میں ہے۔ ایک ایسی جنگ جس کا بالن اس دنیا کی سُپر اور ایٹمی طاقتوں سے بھی آتا ہے، ہنود و یہود کے ملکوں سے بھی اور کئی ایک برادر اسلامی ملکوں سے بھی۔ یہ ممالک دامے، درمے، سخنے، بل کہ اسلحے، گوریلے، سورمے میرے وطن کی آگ کا الاؤ تیز کرتے رہتے ہیں۔ یہ آگ بجھاتے بجھاتے ہماری ماؤں کے آنسوؤں کا دریا خشک ہو گیا ہے۔ سہاگنوں کی منتظر آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔ بچوں کے ننھے ننھے خواب خاک ہو کر بکھرنے لگے ہیں۔ لہو کا رواج اتنا پڑا کہ محبت کی جنس ہی ناپید

ہوگئی۔ زمین پر اتنے بم پڑے کہ اس کی کوکھ بانجھ ہوگئی۔ ہواؤں میں زہر گھولا گیا، ہمارے پنچھی کی اور دیس کو منہ کر گئے۔ بزرگ ٹِھلدی بیڑیوں کی سواری کی دعا کرتے ہیں، جوان ترقی یافتہ ملکوں کو جوق در جوق چلے جاتے ہیں۔ بچے چھوٹے چھوٹے صحنوں میں مقید ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہر طرف گھٹن ہی گھٹن ہے۔ میرے ملک میں اب ہوا بھی ڈری ڈری سی رہتی ہے کہ کہیں بارود کو نہ چکھ لے، اپنی آکسیجن کو شعلوں میں نہ جھونک بیٹھے۔۔۔ سو وہاں جانا مناسب نہیں ہوگا۔

مگر جینی کی آنکھوں میں میرے گھر، میرے وطن کی محبت کا دیپ روشن ہو چکا تھا جسے بجھانے کا مجھے حوصلہ نہ ہوا۔ سو میں نے ارادہ بدلا اور اسے اپنے وطن کا وہ رخ دکھانے لگا جس کو میں نے خود بھی درسی کتابوں کے علاوہ شاید ہی کہیں دیکھا ہو۔ جس چمن زار کی تصویر میں نے بنائی وہ میرا خواب تو تھا مسکن نہ تھا۔ یہ مملکتِ محبت کروڑوں پاکستانیوں کی حسرت تو تھی، حقیقت نہ تھی۔

''جینی! پاکستان رُوئے زمیں پر بچھی ایک جنت کا نام ہے۔''

اس نے اپنا سر میرے سینے پہ رکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

''اس جنت کے چار موسم ہیں: ایک میں پیار بویا جاتا ہے تو عشق کی فصل تیار ہوتی ہے، دوسرے موسم میں حسن بوتے ہیں اور منوں کے حساب سے رُومان اٹھاتے ہیں۔ تیسرے میں شیرینی بو کر سُر کاٹے جاتے ہیں، جب کہ چوتھا موسم جذبوں کے بونے کا ہے، جس کے آخر میں گُلِ اخلاص پُھوٹتا ہے۔ میرے وطن میں محبت اس قدر وافر ہے جیسے تمہارے یہاں ہَوا۔ اسی ہوا کے مزے لینے پرندے سائبیریا اور روس سے ہمارے ملک میں سیاح بن کر آتے ہیں۔ دھرتی ماں کا روپ اس قدر مقدس ہے کہ اکثر لوگ اس پر ننگے پاؤں چلتے ہیں۔ ہمارا آسمان اتنا مہربان ہے کہ کسی چڑیا کے پر میں بھی کانٹا چبھے تو اسے سہلانے اتر آتا ہے۔ ہمارے ہمسائے اس قدر مہذب ہیں کہ صبح شام کچھ نہ کچھ بھیجتے رہتے ہیں: کبھی کچھ کھانے کو تو کبھی پینے کو، کبھی پڑھنے کو تو کبھی لکھنے کو۔ ہمارے جوانوں کو جگانے اور بچوں کو سلانے تک میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ ہمارے بادل، ہماری ہوائیں اور ہماری خُوش بوئیں، ہمارے شاعروں کے ساتھ ہم کلام رہتی ہیں۔ میرے وطن میں

جن، بھوت، بلا، وبا نام کی کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ لوگ لوگوں سے گلے ملتے نہیں تھکتے۔ اجتماعیت ہے کہ بڑھتی جا رہی ہے۔ انفرادیت کو زوال ہے۔ دکھ ہو تو سب میں برابر برابر بانٹ کر ہلکا کر لیا جاتا ہے، خوشی ہو تو ہر سو پھیلا کر دوبالا کر دی جاتی ہے۔ نہ کوئی کسی سے جلتا ہے، نہ حسد کرتا ہے۔ ہماری زبانوں کے لفظ امرت رس سے بنتے ہیں، قواعد شہد میں لکھے جاتے ہیں۔ ہمارے بزرگ مرتے ہیں تو ستارے بن کر ہمارے آسمان پر ٹمٹمانے لگتے ہیں۔ بچے مرتے ہیں تو پھول بن کر آنگن میں اُگ آتے ہیں۔''

جینی میرے کلامیے میں گم ہو چکی تھی۔ اس کی بند آنکھوں کے پیچھے جو منظر تھا، اسے شانت کیے جا رہا تھا۔

''اور جینی، ہمارے پرندے نہ صرف خود اپنے رشتے تلاشنے کے معاملے میں خود کفیل ہوتے ہیں بل کہ ہم لوگوں کی بھی آپس میں سلام دعا کرانے کے لیے چٹھیاں لانے لے جانے میں طاق ہوتے ہیں۔''

جینی جواب تک ایک سحر سے میں تھی، فوراً ہنس دی۔

"Come on, Saleem. Don't criticize my Sasa. And I was just kidding about going to Pakistan."

میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا تو میری ناک پہ انگلی رکھ کے کہا:

"My poetic tale-teller!"

میں نے کوئی تاثر نہ دیا تو ذرا معذرت خواہانہ لہجے میں کہنے لگی:

"I know Pakistan has issues but I would love to believe in what you've just said."

جو میں نے کہا وہ سب سچ ہے، جینی!! کسی اور زمانے کا سچ۔

--☆--

ابو جی پرندوں کے شکار کے بہت شوقین تھے۔ طرح طرح کی بندوقیں رکھتے، بازار کے کارتوسوں پر تکیہ کرنے کے بجائے اپنے ہاتھوں سے طرح طرح کے کارتوس بناتے۔ چھوٹے پرندوں کو بڑے زخموں سے بچانے کے لیے چھوٹے چھوٹے چَھرے بنا کر کارتوس بھرتے، بڑے پرندوں کے لیے بڑے چھرے بناتے۔ کبھی ہرن کا شکار کرنا ہوتا تو ایس جی/ایل جی، یا پھر رائفل استعمال کرتے۔

سردیوں کی ایک شام میں ہلکی ہلکی بوندا باندی کی ٹپ ٹپ سے محظوظ ہونے کے لیے امی جی، ابو جی اور میں چائے کی چسکیاں لے رہے تھے کہ گاؤں کے کچھ بچے سردی سے بے نیاز دوڑتے ہوئے آئے اور مغرب کی طرف اشارے کر کر کے ابو جی کو بتانے لگے کہ کونجیں آ رہی ہیں۔ جوں ہی بچوں کی بے ربط بات ان کی سمجھ میں آئی وہ بجلی کی سی تیزی سے اٹھے اور دیوار پر لٹکی بندوق کو اٹھا لیا۔ پھر کارتوسوں کے ڈبے اٹھائے مگر سب کو خالی پا کر مایوس ہو گئے اور باہر آ کر بچوں کے اشاروں کا تعاقب کرنے لگے۔

کونجیں ایک لمبی قطار میں اڑتی ہوئی ہمارے صحن کے اوپر آ چکی تھیں۔ اچانک ابو جی کے دماغ میں کوئی ترکیب آئی۔ ''یہ تو بہت کم بلندی پہ اڑ رہی ہیں۔'' انھوں نے گویا خود سے کہا اور ایک ڈبے میں سے جس پر ''بغیر چَھرے والے'' لکھا تھا، ایک کارتوس نکال لائے، بندوق میں ڈالا اور کونجوں کی طرف اشارہ کر کے فائر کر دیا۔ اس زور کا دھماکہ ہوا کہ میرے ہاتھ سے چائے کا کپ چھلک گیا اور شکار کے شوقین ایک بچے کا مثانہ۔ ساتھ ہی کونجوں کی قطار کی آخری مسافر سر کے بل پانی کے ایک ٹوبے میں آ گری۔ بچوں نے خرگوش کی سی پھرتی کے ساتھ اسے اٹھا لیا۔ عام دنوں میں ابو جی فائر کر کے سکون سے بیٹھ جاتے تھے کوئی بچہ شکار اٹھا لاتا اور وہ ذبح کر دیتے۔ آج وہ بھی شکار کی طرف ''زندہ ہو گی، زندہ ہو گی'' کہہ کر دوڑ پڑے اور اسے بچوں سے جا لیا۔ کونج صحیح سلامت تھی۔

''شادیوں والا کارتوس چلایا ہے کیا؟'' امی جی نے حیرت سے پوچھا۔

''جی ہاں، ان بے چاریوں کے دل بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ خالی ٹھاکے سے گر گئی۔''

اس زمانے میں آتش بازی کا رواج ابھی گاؤں میں نہیں ہوا تھا۔ اس لیے شادی بیاہ پر خوشیاں منانے کے لیے بغیر چھرے کے کارتوس چلا کر ہلا گُلا کر لیا جاتا تھا۔

بارش رک چکی تھی۔ ابو جی نے کونج کے پر اور پاؤں باندھے اور اسے صحن میں بٹھا دیا۔ پھر دو چار پائیاں نکال کر ہم سب صحن میں جا بیٹھے۔ ہمسائیوں کے بچے آئے، کچھ خواتین آئیں، تایا جی آئے، علی کے ابو آئے، منزہ کی امی آئیں۔۔۔ الغرض اک ہجوم سا لگ گیا۔ اچانک، رسن زدہ کونج نے ''کریں، کریں'' کرنا شروع کر دیا۔ جواباً آسمان نے بھی وہی صدا لگائی۔ سب نے نظر اٹھا کر جو دیکھا تو ساری کونجیں ایک ہالہ بنا کر اپنی اسیر سکھی کا طواف کر رہی تھیں۔ ابو جی نے افسردگی سے کہا کہ اب چَھرے کے بغیر بھی کوئی کارتوس نہیں بچا ورنہ ایک آدھی اور بھی گرا لیتے۔ ہم ان کونجوں کو دیکھ ہی رہے تھے کہ ایک کونج اپنے کارواں سے بچھڑی اور ہمارے آنگن میں لگے نیم کے درخت پر آ بیٹھی۔ پھر اس سے پہلے کہ ابو جی تایا جی کے مشورے سے اسے پکڑنے کی کوئی تدبیر کرتے، وہ کونج اڑی اور ہم سب کی موجودگی کو للکارتے ہوئے، ہمارے حصار میں پڑی اپنی سہیلی کے پاس آ گئی۔ دونوں نے لمبی لمبی گردنیں ایک دوسرے کے گلے میں ڈالیں اور رُوس کی یخ بستہ وادیوں کی کسی بولی میں ایک دوسرے کو الوداع کہنے لگیں۔

''نر مادہ ہیں شاید۔'' ابو جی نے آہستہ سے کہا۔

باقی سب ابھی ورطۂ حیرت میں تھے کہ ایک بچے نے جھپٹی ماری اور نئی آنے والی کونج کو دبوچ لیا۔ ہُو ہکار مچ گئی، تالیاں بجیں، نعرے لگے، مبارک بادیں دی گئیں۔ سب کو معلوم تھا کہ اب دیگچے چڑھیں گے، ضیافتیں اڑائی جائیں گی۔

میں نے دیکھا ابو جی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ چارپائی سے اٹھے، ایک بھرپور انگڑائی لی، چہرے پر ہاتھ پھیرا، اوپر طواف کرتی کونجوں کو دیکھا۔ ایک قدم آگے بڑھے، بندھی ہوئی کونج کے پَر کھولے، اسے گلے سے لگایا اور ہوا میں اچھال دیا۔ شوقِ شکار کے دیوانے بچوں کی شکل رونے

والی ہوگئی۔ پھر ابو جی نے دوسری کونج کو بچے کے ہاتھ سے لیا، اسے چوما، پیار کیا، بھرائی ہوئی آواز میں ''قربان تیری محبت کے'' کہا اور اسے بھی آزاد کر دیا۔

تایا ابو نے بچوں کو تالیاں بجانے کو کہا جو انہوں نے کونجوں کی آزادی پر خوشی سے زیادہ تایا جی کے غصے سے بچنے کی خوشی میں زور زور سے بجادیں۔

اُس روز تالیوں کی گونج میں میں نے سوچا محبت اگر اور کہیں نہیں ہے تو اس سمت میں ضرور ہے جہاں سے یہ کونجیں آتی ہیں۔

محبت کے اس انوکھے دن کے بعد کئی برس تک ہر سردیوں میں کونجوں کا ایک قافلہ ہمارے گھر کے اوپر آ کے طواف کرتا، محبت کے ترانے گاتا، گاؤں کے لوگ انہیں مار گرانے کے لیے تڑپتے مگر پھر ابو جی کا وہ اعلان یاد کر کے رہ جاتے جو انہوں نے مسجد کے لاؤڈ سپیکر پر خود جا کے کیا تھا:

''آج کے بعد اس گاؤں میں آنے والی مسافر کونجیں میری مہمان تصور کی جائیں۔ کوئی بھی انہیں شکار کرنے کی جرأت نہ کرے۔''

انہیں کونجوں میں سے ایک کونج کافی نیچے اتر آتی اور کسی برف پوش وادی کی زبان میں محبت کی لاج رکھنے والوں کی تحسین کرتی۔ کبھی کبھی ہمارے آنگن کے پیڑ پر آ بیٹھتی اور اس وقت تک نہ اٹھتی جب تک ابو جی باہر آ کر اسے خدا حافظ نہ کہہ دیتے۔

اور پھر حالات کچھ یوں بدلے کہ میرے وطن کے لوگ آسمان کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھنا ہی بھول گئے۔

--☆--

﴿۱۲﴾

میری ادھوری محبت اینا کے برعکس، میری نئی دوست جینی کی محبت میں زندگی تھی، رچاؤ تھا، میرے لیے وقت تھا۔ یونی ورسٹی کی طالبہ ہونے کی وجہ سے اس کی بھی اتنی ہی چھٹیاں ہوتی تھیں جتنی کہ میری۔ چناں چہ کوئی جلدی نہ تھی۔ ہم نے طے کیا کہ ان گرمیوں میں زندگی کے سارے مزے لیں گے۔ بولڈر شہر کے باہر ایک بہت بڑے فارم ہاؤس پر ایک رائڈنگ کلب تھا۔ ہم وہاں جا کر گھڑ سواری کرتے۔ ایک انڈین موسیقی کی اکادمی میں جاتے۔ جینی پیانو بجاتی، میں طبلہ اور بانسری۔ ہفتے میں دو دن یوگا کرنے جاتے۔ بدقسمتی سے یوگا سینٹر بھی ہندوستانیوں کا تھا لیکن جینی کی محبت میں مَیں یہ سب سہہ رہا تھا۔ ہم مِنی گالف کھیلتے، بائکنگ کے لیے نئے نئے ٹریکس ڈھونڈتے، ہائکنگ کرنے جاتے، سکیٹنگ کرتے اور سرد موسم میں کبھی کبھی برڈنگ کرنے بھی چلے جاتے۔ اس سب کچھ میں ہم اتنے مگن ہوئے کہ ہمیں فکر ہی نہ رہی کہ ساسا اور ساسی کے احساسات کیا ہوں گے۔ وہ ہمارے تعلق اور سرگرمیوں کے بارے میں بیٹھ کر کیا باتیں کرتے ہوں گے، میڈی اور اس کا کتا کیا سمجھتے ہوں گے، خالد کیا رائے رکھتا ہوگا یا نِک کیا سوچتا ہوگا؟

ایک دن جینی مجھے بولڈر کے ہمسائے میں موجود اپنے شہر لانگ مونٹ لے گئی جہاں اس کے ماں باپ مسٹر اینڈ مسز جیمز اور چھوٹی بہن صوفیہ رہتے تھے۔ تمام امریکیوں کی طرح جینی کے والدین بھی بہت مہمان نواز تھے۔ انھوں نے میرے لیے طرح طرح کے پاکستانی کھانے

تیار کیے ہوئے تھے اور چھوٹی موٹی تعریف پر بار بار انٹرنیٹ اور گوگل کا شکریہ ادا کر رہے تھے جن کی بدولت تراکیب حاصل کرنا ممکن ہوا تھا۔ جینی کے والد ہر بات پر مذاق کا پہلو نکالنے میں طاق تھے۔ کھانے کے بعد ہم ایک لمحے کے لیے ڈائننگ ٹیبل پر اکیلے رہ گئے تو میں نے ایک پکوڑہ نما جلیبی جو ڈیزرٹ کے طور پر پیش کی گئی تھی، اٹھاتے ہوئے ایک مرتبہ پھر ان کے کوکنگ سکلز کی تعریف کی اور اس سے پہلے کہ وہ انٹرنیٹ کا شکریہ ادا کرتے، میں نے خود ہی کہہ دیا:

"I can't thank internet enough for the tastes it brought to me today."

"Nor can I."

جینی کے باپ نے حتمی انداز میں کہا اور ثبوت بھی دے ڈالا:

"It's because of the internet that the number of women I alone have closely seen is far greater than those seen by my all male ancestors together."

میں نے ایک فلک شگاف سا قہقہہ جوڑا مگر مسز جیمز کے واپس آ جانے کی بہ دولت مجھے اپنے قہقہے کو کوزے میں بند کرنا پڑا۔ وہ مجھ سے پوچھنے لگیں کہ ڈنر کے بعد میں کون سی شراب پسند کرتا ہوں۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی بہانہ تراشتا، جینی اندر آ گئی اور ماں کو منع کرتے ہوئے بولی کہ سلیم نے ڈرائیونگ کرنی ہے لہٰذا وہ شراب نہیں پیے گا۔

جب ہم واپس ہاسٹل کو آ رہے تھے تو میں نے جینی سے کہا کہ اس کے والد بہت دل چسپ آدمی ہیں اور ان کی حسِ مزاح متاثر کن ہے۔ جینی نے مجھے دیکھا اور ہنس کر کہا کہ یہ حسِ مزاح ہی تو ہے کہ ممی ابھی تک ان کے پاس ہیں۔ ورنہ وہ تو لیزبین ہیں اور مستقل اپنی گرل فرینڈز کو ڈیٹ کرتی ہیں۔

اسے اندازہ نہ تھا کہ وہ مجھے کیا بتا رہی ہے۔

--☆--

بشکو نائی کی بیوی کا نام شادی تھا۔ جب ہم قدرے بڑے ہوئے تو بشکو قریب بارہ ماہ ہی بے روزگار رہنے لگا سوائے ان چند دنوں کے جب گاؤں میں کوئی شادی ہوتی اور وہ گاؤں میں کانڈھے بانٹنے میں مصروف ہو جاتا۔ اس لیے شرارتی لڑکے بالکے مذاقاً کہتے کہ بشکو مصروف ہو یا بے روزگار کام ہمیشہ ''شادی'' پر ہی کرتا ہے۔ خیر اسے روزگار کی زیادہ فکر اس لیے نہیں تھی کہ ایک تو اس کی بیوی شادی گاؤں کے بڑے گھروں میں کام کر لیتی تھی، دوسرا ہر فصل کی بار اٹھانے کے وقت وہ زمین داروں سے اولکھ وصولنے پہنچ جاتا۔ پھر فیشن ایبل باربر شاپس کھل جانے کے باوجود بھی کچھ بڑے بوڑھے اپنی حجامت اسی سے ہی بنواتے تھے جن میں منزہ کے دادا کے علاوہ ہمارے تایا ابو بھی شامل تھے۔ بزرگ افیون کی ٹکڑی کھائے ہوئے ہونے کی وجہ سے حجامت کے دوران میں ہی شوکنے لگتے اور نیم بند آنکھوں سے بشکو کی شکل میں اپنی محبوباؤں کو تصور کر بیٹھتے۔ بشکو ان کے کُھردرے گالوں پر گیلا ہاتھ پھیرتا یا ٹھوڑی کے بال استرے کے نشانے پر لانے کے واسطے ہونٹ پکڑتا تو بزرگ سرور سے گزر کر نیند میں اتر جاتے۔ بشکو ان کی شیو مکمل کرتا، منہ پر ڈیٹول ملتا، کریم لگاتا، چوکٹی سے اٹھا کر چارپائی پر ڈالتا، ان کی تہبند ٹھیک کرتا اور گھر کو چل پڑتا۔

کبھی کبھار یہ بزرگ بشکو سے علاقے کی مشہور عورتوں کی باتیں بھی کرتے۔ ایک دن، جب ٹکڑی چڑھنے لگی تو منزہ کے دادا نے بشکو سے اس کی بیوی کی خیر خبر لے لی: ''اور سنا، وَئے، شادی ٹھیک اے۔''

''جی سائیں ٹھیک اے۔'' بشکو نے کہا اور استرا پتھر پر رگڑ کر کلانے لگا۔

''سنا ہے، محی الدین کے گھر بھی جاتی ہے؟''

منزہ کے دادا نے ہنس کر تایا ابو کا نام لیا۔

''جی سائیں جاتی ہے۔''

''ٹکڑی افیون کی لے جانا، مجھ سے شام کو، شام کو، خوش ہو، کھالینا، کھالینا، اچھا ہوتا، کھالینا۔'' منزہ کے دادا کی زبان پر افیون لنگر انداز ہونے لگی تھی۔ بشکو نے دانت پیسے اور شیو کرنے میں محو رہا۔

اگلی صبح جب شادی ہمارے تایا سردار محی الدین خان کے گھر کام کی غرض سے جانے لگی تو بشکو نے منع کر دیا۔ تاہم اس کے منع کرنے کے انداز میں وہ نائی پن تھا جس کو شادی تو کیا کوئی بچہ بھی سنجیدہ نہ لیتا۔۔۔ سو وہ اسے گالم گلوچ کرتے چلی گئی۔

''اس کھجی کے پار گئی تو میری طرف سے تمھیں طلاق ہے۔''

بشکو کے لہجے میں اب بھی نائی پن تھا مگر آنکھوں میں ایک عجب خوف اتر آیا تھا۔

شادی نے مڑ کر دونوں ہاتھوں کے پنجے پھیلا کر اس پر لعنت کی، دو چار ننگی گالیاں دیں اور آگے بڑھنے لگی۔

''او بھونڈن، کھجی کے پار نہیں جانا۔'' بشکو نے پھٹتی ہوئی آواز میں تنبیہ کی مگر شادی کے دماغ پر معلوم نہیں کیا سوار تھا کہ کندھے لہراتی آگے بڑھتی گئی۔ جونہی وہ کھجور کے درخت کے اس پار آئی زمین اس کے پیروں تلے سے سرکنے لگی۔

اسے طلاق ہو چکی تھی۔

بشکو نائی نے اسے طلاق دے دی تھی۔ اب یہ گھر ایک نامحرم کا گھر تھا۔ یہ کھجی جسے برسوں سے وہ بلا ضرورت پانی کے ڈول بھر بھر کے پلاتی آئی تھی اچانک اس کے سہاگ کی ویری ہو گئی تھی۔ اس نے مڑ کر خوف اور غصے میں پیچھے دیکھا۔ بشکو اس کا نامحرم ہوا کھڑا تھا۔ شادی پر اس سے پردہ واجب ہو گیا تھا۔

بشکو کی نظروں میں التجا تھی۔ وہ بھاگ کر اس کے پاس آیا۔

''ایسے نہیں ہوتی طلاق، شادی۔'' اس نے روتی ہنسی ہنس کے کہا۔

''مولا پاک کی قسم...... مذاق کر رہا تھا۔ سمجھ کھجی ادھر تھی ہی نہیں۔ سمجھ میں رمظی کے بھانے والی کھجی

کی بات کر رہا تھا۔ ٹنڈ منڈ ٹنڈ منڈ۔۔۔'' اس نے رمظی کی کھجی کا مذاق اڑا کر شادی کو ہنسانے کی کوشش کی۔

''آ جا واپس۔'' اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''چلو، بس بتانا نہ کسی کو، بھونڈن''۔

شادی نے جھٹک کر اپنا ہاتھ چھڑایا اور دوپٹے سے چہرہ چھپا کر دروازے پر جا کھڑی ہوئی۔

''مولبی سے پُچھ آ جا کے، حرامی۔ سور کی اولاد مر کیوں نئیں جاتے ہو۔ اگر مولبی کہے کہ نئیں ہوئی تو مجھے لے جانا محی الدین کے گھر سے، ورنہ میری بھیڑی قسمت۔''

بشکو نائی کو امید نظر آئی تو اس کے تعاقب میں دوڑ لگا دی۔ تیکھے تیکھے قدم اٹھاتا وہ مولوی امان اللہ کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کا ٹوٹا ہوا جوتا بار بار پاؤں سے اتر کر دور جا گرتا، وہ رک کر اسے غصے سے دیکھتا، اس جوتے کی ماں کے ساتھ محی الدین کے ناجائز تعلقات کی کوئی صورت نکال کر اس کے گوش گزار کرتا اور پھر اٹھا کر پہن لیتا۔ ایک بار اس نے غصے میں آ کر اس اترے ہوئے جوتے کو اٹھا کے زور سے زمین پر پٹخا تو اس کے دو تین ٹکڑے ہو گئے۔ اس نئی آفت کے آ پڑنے سے اسے کچھ دیر کے لیے منزہ کے دادا کی بات، محی الدین، شادی اور طلاق سب بھول گئے۔ وہ وہیں بیٹھ کر کیکر کے کانٹوں سے جوتے کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑنے لگا۔ جونہی جوتے کی شکل بحال ہوئی تو اسے ٹوٹا ہوا گھر یاد آیا۔ اس نے جوتا پہنا اور مسجد کی طرف بھاگنے لگا۔ جوتے پر لگے کانٹے چبھ چبھ کر اسے لنگڑائے جا رہے تھے۔ ایک موقع پر وہ رکا اور دونوں جوتے اتار کر دور کھیت میں اچھال دیے اور فوراً ہی بہت پرسکون ہو گیا۔ جیسے اس کے سر سے کوئی بھاری سا بوجھ اتر گیا ہو۔

بشکو ننگے پاؤں مسجد سے ملحق حجرے میں بیٹھے مولوی امان اللہ کے پاس پہنچ گیا۔ مولوی صاحب پلنگ نما چارپائی پر نیم دراز تھے۔ پانچ وقت کا نمازی، سادا، پاس بیٹھا ان کے پاؤں دبا رہا تھا۔

بشکو نے مولوی صاحب کو اپنا مسئلہ بتایا اور آخر میں کہنے لگا: ''مولبی صائب، مذاق میں

تو طلاق نہیں ہوتی ناں؟ شادی کھچی کے برابر تک گئی تھی، نہ، نہ پار نہیں گئی۔ بس سمجھ برابر بھی اتنی سی گئی تھی۔ گوڑ نہ، مولا کی قسم میں کر بھی نقل مذاق رہا تھا۔۔۔"

مولوی صاحب کبھی طلاق کا وقت پوچھتے، کبھی جھگڑے کی وجہ۔ کبھی طلاق کا مقام پوچھتے، کبھی دونوں کے درمیان فاصلہ اور کبھی بشکو کو الزام دیتے کہ تم تفصیل نہ بتا کر طلاق کو ہضم کرنا چاہتے ہو۔

مولوی امان اللہ نے اسے حلالہ کرانے کا مشورہ دیا، شریعت کے متعلقہ نکتے سمجھائے اور تسلی دی کہ یہی صحیح ہے۔

"عدت کے بعد ایک ہی رات کا حلالہ اور اس کے بعد جلد ہی شادی تمہارے ویہڑے واپس آ بیٹھے گی۔ ساری عمر اکیلے رہنے سے تو بہتر ہے ذرا سا صبر کر لو۔ تمھارے بھلے کی بات کرتا ہوں۔ سمجھ رہے ہو ناں؟"

"جی مولبی صائب۔" بشکو نے گویا یہ کڑوا گھونٹ بھرنے کی ہامی بھر لی۔

اب مولوی بشکو کو لے کر اپنے گھر گیا اور اسے پلانے کے لیے شربت کا گلاس بھر لایا۔ پھر اسے کھیتوں کی طرف لے جا کر مذہب کے مطابق زندگی گزارنے کی تلقین کرنے لگا۔ اس نے اسے سمجھایا: "بشکو اب تُم داڑھی رکھ لو۔ بچہ تمھارا ہوتا نہیں۔ اللہ اللہ کرو۔ اُس سے لَو لگا لو بس، بہت مزہ آئے گا، آخرت کا سامان کرو۔ ایک شادی تو کیا بہتر حوریں ملیں گی، حوریں۔" دو تین گھنٹے گزر گئے تو مولوی نے بشکو کو بتایا:

"تم موبجھے نہ ہو، میں کروں گا حلالہ۔"

اور اس حلالے کی مدد سے شادی آج دن تک مولوی صاحب پر حلال اور بشکو پہ حرام ہے۔

--☆--

ہم جینی کے گھر سے واپس ہاسٹل پہنچے تو اینا ڈائننگ ہال میں پڑے کافی میکر سے اپنا مگ بھر رہی تھی۔ ہمارے قدموں کی چاپ سن کر یا شاید میری سانسوں کو محسوس کر کے اس نے

گردن گھمائی اور ہمیں "ہائے" بولا۔ پھر ہم سے کافی کا پوچھا تو جینی نے لُندھوں کی طرح ہاں بول دیا۔ اینا اپنا کپ ہمارے سامنے میز پر رکھ کر واپس کافی میکر کی طرف جانے لگی تو میں نے کہا:

"Brown sugar; two spoons, please."

اس نے گردن گھمائی اور مجھے گھور کر دیکھا جیسے کہہ رہی ہو: 'میں جانتی ہوں، سلیم۔ اتنی جلدی کیسے بھول سکتی ہوں تمھاری کافی کو۔ جواباً میں نے آنکھوں سے اس مہربانی پر شکریہ ادا کرنے کی کوشش کی۔ خیر ہم تینوں ڈائننگ ہال کے اس گول ٹیبل پر بیٹھ کر چسکی چسکی کافی سُڑکنے لگے اور ادھر ادھر کی گپیں ہانکنے لگے۔ اس نے بتایا کہ نِک کی گرل فرینڈ آئی ہوئی تھی، وہ اسے Garden of gods دکھانے کولوراڈو سپرنگز گیا ہوا ہے۔ میں نے اس سے اس کے کام کا پوچھا تو اس نے بتایا کہ چھٹیاں ختم ہوئیں تو ڈھیر سارا کام پینڈنگ پڑا تھا سو وہ آج کل بہت مصروف رہتی ہے۔ اس نے مجھ سے پاکستان میں میرے گھر والوں کی خیریت پوچھی، جینی سے ساسا کا پوچھا اور پھر "See you" کہہ کر چل دی۔

وہ جانے لگی تو جینی کو کچھ یاد آیا۔ اس نے اسے آواز دے کر روکا اور رَیش کا حال پوچھ لیا۔ اینا مڑی، دائیں ہاتھ کو ذرا اوپر اٹھایا اور گراتے ہوئے کہا:

"We are not dating anymore."

جینی کو یہ جواب دے کے اور میری ٹانگوں پہ سرسری سی نظر ڈال کر وہ چلی گئی۔ ردِعملاً میری ٹانگیں خود تو نہ کانپیں مگر کسی طرح رونگٹوں کو ہلا سا دیا۔ وہ نظر سے اوجھل ہوئی تو جینی احمقوں کی طرح ہنسنے لگی اور پھر اٹھ کر آئی اور کرسی جوڑ کر میرے ساتھ چپک کے یوں بیٹھ گئی کہ اس کا سر میرے دائیں کاندھے پر آ سوار ہوا۔

"Saleem." اس نے کچھ دیر بعد کہا۔

"Jenny." میں نے خود پر جبر کر کے جوابی سرگوشی کی۔

"Pakistanis are better than Indians, right?"

"Yes."

مجھے غصہ بھی آ رہا تھا اور حیرت بھی۔ جینی یہ سوال کیسے کر سکتی تھی۔ یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات تھی۔

"You won't ever leave me, right?'

اچھا تو یہ بات تھی۔

"Never."

میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا تو جینی کو جیسے کل کائنات مل گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور میرے کندھے پر سر رکھ کر تقریباً لیٹ ہی گئی اور تا دیر اسی کیفیت میں ڈوبی رہی۔ نہ اس نے اینا کو دوبارہ ڈائننگ ہال میں آتے دیکھا، نہ جس کام کے لیے آئی تھی اسے کیے بغیر واپس جاتے دیکھا، نہ سعودی بھائی خالد کو چُھری لے کر کچن میں گھستے دیکھا، نہ سیب کاٹ کر پلیٹ میں لے جاتے دیکھا......اور نہ ہی ڈائننگ ہال کے اینا والے دروازے پر میری آنکھ کو پتھراتے دیکھا۔

بس آنکھیں بند کیے بیٹھی رہی۔

کافی دیر تک یوں پر وتھا ٹکر بنے رہنے کے بعد جینی کو ساسا اور ساسی یاد آئے تو مجھ سے باقاعدہ اجازت طلب کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی، میں بھی تھک چکا تھا۔ اٹھا اور اپنے کمرے میں آ گیا، کپڑے وغیرہ بدلے۔ لائٹ آف کی اور سونے کے لیے بیڈ پر جانے ہی لگا تھا کہ ہلکی سی دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو سامنے اینا کھڑی تھی۔ وہ یقیناً اندر آنا چاہتی تھی مگر میں جینی سے دھوکا نہیں کرنا چاہتا تھا یا شاید اس کی وجہ تھکاوٹ تھی۔۔۔ یا مجھے کسی پاگل کتے نے کاٹ لیا تھا کہ میں نے اسے اندر نہ آنے دیا اور دروازے میں ٹھہر کر اینا سے اس کی تشریف آوری کا سبب جاننے لگا۔ اس نے بتایا کہ کوئی وجہ تو نہیں تھی بس ادھر سے گزر رہی تھی تو سوچا کہ مجھ سے ملتی جائے۔ میں نے زہر آلود مسکراہٹ کے ساتھ کہا کہ یہ اس کی دھیلا نوازی تھی ورنہ آج کل غریبوں کو کون پوچھتا ہے۔ اس پر وہ کہنے لگی کہ سلیم تم غریب نہیں ہو۔ تمھارے پاس سب کچھ ہے۔ پھر جانے کے لیے ایک قدم اٹھایا اور ٹھہر کر کہا:

"Saleem, Yash worships mice."

"His choice!"

میں نے بہت بے نیازی سے کہا حالاں کہ مَیں جانتا تھا کہ میرے بچپن کے دانتوں کے چور چُوہے کبھی بھی قابلِ پرستش نہیں ہو سکتے۔

'تو یہ وجہ تھی اینا اور ریش کے ترکِ تعلق کی،' میں نے بستر کی طرف پلٹتے ہوئے سوچا۔

--☆--

یہاں ہر کوئی ماسٹر جی کی نصیحت پر عمل پیرا ہے؛ سب محبت کے متلاشی ہیں۔ ان کھوجیوں کی کئی قسمیں ہیں۔ محبت کو ماپنے کے لیے ان کے ہاتھوں میں طرح طرح کے پیمانے ہیں۔ کسی کو گوری رنگت کی تلاش ہے، کسی کو سانولی کی۔ کوئی سرو قامت کو ڈھونڈتا پھر رہا ہے تو کوئی خوش گفتار کو۔ کسی کو عقلِ سلیم چاہیے تو کسی کو جسمِ جمیل۔ کسی کو تیکھے نین چاہییں تو کسی کو معصوم آنکھیں۔ کوئی رومانیت تلاشتا ہے تو کوئی مادیت۔ یہ سب پیمانے میرے ملک میں بھی رائج ہیں مگر وہاں ایک اور چیز بھی تلاشِ محبت کے کھیل کا حصہ ہے اور وہ ہے نفرت۔ اس نفرت کی بنیاد پر میرے لوگوں نے ایک مائنس فارمولا گھڑ لیا تھا۔ محبت کی کھوج میں نکلنے سے پہلے مائنس کمی، مائنس موچی، مائنس نائی، مائنس بیوہ، مائنس مطلقہ، مائنس سنی، مائنس شیعہ، مائنس پنجابی، مائنس مہاجر، مائنس سندھی، مائنس سرائیکی، مائنس کشمیری، مائنس پٹھان، مائنس بلوچ، مائنس براہوی......وطن سے دور آنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ نفرت کی ایکویشن سے نکلے یہ فارمولے مجھ پر بھی لاگو ہوتے تھے۔ حالاں کہ میرے نزدیک اصل محبت فارمولوں سے ماورا تھی؛ کسی سے بھی ہو سکتی تھی؛ کہیں بھی ہو سکتی تھی۔ یوں فارمولوں سے بچتا بچاتا میں اپنی محبت جینی کے پاس آ پہنچا تھا۔

--☆--

بے وقت کی کافی پی لینے کی وجہ سے اب مجھے نیند سے زیادہ فلسفے آ رہے تھے۔

موبائل کی میسج بیل بجی تو میں نے فوراً اٹھا کر لاک کھولا۔

Jenny wrote: "Wanna go to Sofia's school tomorrow."

میں نے سوچا جواب دیے بغیر سو جاؤں اور صبح بہانہ کروں کہ رات جلدی سو گیا تھا۔ پھر میری امریکا کو دیکھنے کی مہم جو حس پھڑکی۔ امریکا کو سمجھنا میرے نزدیک کائنات کو سمجھنے کے مترادف تھا۔ صوفیہ کے سکول کو دیکھنے سے مجھے امریکا کا ایک اور رخ دیکھنے کو ملے گا۔ سو میں نے ہاں بولا اور لیٹ گیا۔

--☆--

صوفیہ کے سکول کے ہال میں داخل ہوتے ہی میں دنگ رہ گیا۔ اتنا بڑا ہال پاکستان میں ایک ہی تھا اور وہ تھا اسلام آباد کا کنونشن سنٹر جہاں میری نمل یونی ورسٹی کا کانووکیشن ہوا تھا۔ رضا کار لوگوں کو آسان راستوں سے لے جا کر سیٹوں پر بٹھا رہے تھے۔ لمحے بھر میں جیسے پورا لانگ مونٹ امڈ آیا ہو۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ صوفیہ نے ایک گانے میں حصہ لینا تھا جو کہ chorus میں گایا جانا تھا۔ ایک لائن اس نے اکیلے بھی بولنا تھی۔ جینی اور میں دراصل اس ایک مصرعے کو سننے آئے تھے۔

سب سے پہلے تین مسخرے آئے، ایک امریکی بن کر، دوسرا روسی اور تیسرا سعودی۔ ان تینوں نے اپنی خوب ہنسی اڑوائی۔ وہ واپس گئے تو لائٹس آف کی گئیں۔ ہال سیٹیوں اور shouting سے گونجنے لگا۔ پھر اچانک لائٹس آن ہوئیں تو سامنے مختلف عمروں کی کوئی تیس پینتیس لڑکیاں سفید یونی فارم پہنے قد کی ترتیب سے کھڑی تھیں۔ ہال میں خوش آمدیدی تالیاں بجنے لگیں۔ میوزک بجنا شروع ہوا تو تالیاں اور بھی تیز ہو گئیں۔ پھر ایک بہت ہی خوب صورت بچی نے جو باقیوں سے ذرا آگے کھڑی تھی اپنی سریلی آواز میں گیت کا آغاز کیا۔

Universe, Universe....

اس کے لبوں سے یہ ایک لائن اس قدر خوش الحانی سے ادا ہوئی کہ سب اس کی امامت میں جھوم کر گانے لگیں گویا گیت خوشی سے جھوم اٹھا۔ سب بچیاں اپنی اپنی آواز کا منتر پڑھ کر مجھے مسحور کر رہی

تھیں۔ ایک مقام پر جب صوفیہ نے اپنی لائن بولی تو جینی پاگلوں کی طرح ہاتھ ہلا ہلا کر داد دینے لگی۔ اس نے ہاتھ یوں دیوانہ وار ہلایا کہ اس میں سے جینی کا موبائل نکل کر میرے دائیں طرف والے افرو امریکن کے آگے جا گرا۔ جسے دیکھ کر اس ڈرے ہوئے سے امریکی نے اپنی نشست سے یوں چھلانگ لگائی جیسے بچھو نے کاٹ لیا ہو۔

--☆--

کاٹھ گڑھ کے ایک نزدیکی گاؤں داؤ والی میں ہر سال فلڈ لائٹس میں کرکٹ کا ایک ٹورنامنٹ ہوا کرتا تھا۔ اردگرد کے کوئی بیس پچیس گاؤں سے کرکٹ کی ٹیمیں وہاں آتیں اور ہفتہ بھر جاری رہنے والے اس ٹورنامنٹ میں حصہ لیتیں۔ گرمیوں کی راتیں نہ صرف کھلاڑیوں کے لیے موافق ہوتیں بل کہ دن بھر کی مشقت کے تھکے ہارے کسان بھی تماشائی بن کر گراؤنڈ کی طرف آ نکلتے اور آپس میں گپ شپ کرتے اور کھلاڑیوں کا حوصلہ وغیرہ بھی بڑھاتے۔ ایک کھلاڑی اعجازی اپنے حُسن کی وجہ سے تمام تماشائیوں میں بہت ہی مقبول تھا۔ لوگ تو یہاں تک بھی کہتے تھے کہ جب وہ بیٹنگ کرتا ہے تو مخالف ٹیم کے باؤلر آسان گیندیں کراتے ہیں، جیسے اُن دنوں کے ایک مشہور کیس میں ایک خاتون ماڈل سے استغاثے کے وکیل آسان سوال کرتے رہتے تھے۔ اعجازی کی باری پر اکثر تماشائی آن سائیڈ پر جا بیٹھتے اور اپنے اپنے دماغوں میں گندے گندے خیالوں کی فلم چلا بیٹھتے۔

ایک میچ میں اعجازی کی بیٹنگ کا مزہ لینے کے لیے قریبی گاؤں کے دو لڑکے ندو اور فیفو باقی تماشائیوں سے ذرا ہٹ کر تھرڈ مین باؤنڈری پر لگے روشنی کے راڈ کے نیچے جا بیٹھے۔ ندو نے پلاسٹک کی پُڑیا نکالی، اس کا ربڑ بینڈ ہٹا کر اپنی انگلیوں پر چڑھایا، دائیں ہاتھ کی چٹکی سے نسوار کی ٹکیہ بنائی، پلاسٹک کی پڑیا نیچے رکھی، بائیں ہاتھ سے اپنے نچلے ہونٹ کو پکڑ کر دانتوں سے الگ کیا اور اسی حالت میں ’’فیفو بھرا!! نسوار کریندیں؟‘‘ کہا اور ٹکیہ کو ہونٹ پر رکھ کر اسے چھوڑ دیا۔ فیفو نے نفی میں ناک کو جھٹکا اور خاموشی سے اعجازی کو دیکھا کیا۔ وہ ڈھلوان سی باؤنڈری کو ٹیک

لگائے یوں لیٹا تھا کہ اس کی ٹانگیں بَیٹس مَین کی طرف تھیں۔اس نے زاویۂ نظر کو مناسب رکھنے کی
خاطر دونوں ہاتھ سر کے پیچھے باندھ لیے۔پھر بایاں ہاتھ سر سے ہٹا کر دھوتی میں مارا اور اسے
سامنے سے کھول دیا۔گرمیوں کی ٹھنڈی رات کی خنک ہوا لگی تو فیضو کو مزہ آنے لگا۔

''ندو، وئے!!'' فیضو نے مستی سے کہا۔

''ہاں وئے۔'' ندو نے اونچی آواز میں جواب دیا۔

''بڑی مزے کی ہوا ہے۔'' فیضو نے تقریباً سرگوشی کی۔

''اچھا وئے اچھا'' ندو نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

فیضو موچھوں پر ہاتھ پھیر کر اعجازی کو شاٹس کھیلتے دیکھنے لگا۔اسے اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ شاٹ
اچھا تھا کہ نہیں، رنز بنے کہ نہیں، داد دینی چاہیے یا نہیں۔وہ تو بس خیال کی وحشی چال چلتا،
دھیرے دھیرے اس فاصلے کو گھٹاتا جا رہا تھا جو اُس کے اور اعجازی کے درمیان حائل تھا۔

اِدھر فیضو کا یہ خیال رینگتا ہوا اعجازی کی طرف بڑھنے لگا، اُدھر کہیں سے چلتا ہوا ایک
بچھو فیضو کی تہبند کی طرف بڑھنے لگا۔ابھی فیضو کا تخیل پچ تک نہیں پہنچنے پایا تھا کہ بچھو اس کے تہبند
کے نچلے پلو پر چڑھ آیا۔

''چڑھ ٹرنڑ ڈیسی؟'' بچھو کی موجودگی کی خبر فیضو کے فرشتوں کو بھی نہ تھی۔

''کون وَئے؟'' ندو نے پوچھا۔

''دھاڑ وَئے۔۔۔'' اگلے ہی لمحے فیضو نے اس قدر اونچی آواز میں درد بھری صدا لگائی کہ پورے
گراؤنڈ میں گونجنے لگی۔وہ چھلانگیں لگاتا اٹھا، چیخا چلایا، یا علی، یا علی کہا اور پھر بے ہوش ہو کر گر گیا۔
بچھو اس کی دھوتی سے نکل کر نیچے گرا تو سُن ہو کر بیٹھ گیا۔ندو نے چپل اتار کر اسے مارا اور سب کو
پکارنے لگا۔

''وَئے بھج آؤ وَئے، وَئے فیضو دے ٹٹییں کوں وٹھوواں لڑ گئے وَے......وَئے بھج آؤ جلدی آؤ
فیضو دی نُنز، کوں بچھو کھا گئے۔''

--☆--

سہ پہر کے وقت ہم صوفیہ کے سکول سے لوٹے تو ہاسٹل کے پاس والا سگنل بند تھا۔
سامنے پیدل چل کر سڑک پار کرنے والوں میں مجھے اینا نظر آئی جو ہاسٹل سے مخالف سمت کو جا رہی
تھی۔اس کا مطلب ہے کہ اینا آج کام سے جلدی واپس آ گئی تھی اور اب ہاسٹل میں کپڑے وغیرہ
بدل کر کہیں جا رہی تھی۔بے خیالی میں مَیں نے ہارن پر ہاتھ رکھ دیا۔جینی نے خوف زدہ ہو کر مجھے
دیکھا۔اردگرد کے تمام گاڑیوں والوں اور سامنے پیدل چلنے والوں نے بھی غصے سے مجھے
دیکھا۔اینا نے دیکھا غصے سے، مگر جوں ہی مجھ پر نظر پڑی اس کا غصہ مسکراہٹ میں بدل گیا اور اس
نے میرے ہارن والے سلام کا ہاتھ ہلا کر جواب دیا اور پھر ہاتھ کی درمیانی انگلی الگ کر کے غیر حرفی
گالی بکی اور آگے بڑھ گئی۔جینی اب بھی سلام دعا کے اس نئے طریقے کو سمجھنے اور ہضم کرنے سے
قاصر تھی، سو چپ بیٹھی رہی۔

--☆--

ہاسٹل پہنچ کر میں نے اعلان کیا کہ مجھے کچھ کھانے کو چاہیے اور پول ٹیبل پر ناکنگ
کرنے لگا۔جینی میڈی کے کمرے کی طرف گئی تا کہ اسے بتا سکے کہ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔مگر
اسے وہاں نہ پا کر سیدھی کچن میں چلی گئی۔کچھ دیر بعد کچن سے بھلی بھلی خوش بوئیں آنے لگیں تو
مجھے سمجھ آیا کہ جینی میرے لیے کوکنگ کر رہی تھی۔

"Need help, Jenny?" میں نے اونچی آواز میں پوچھا۔

"Not at all. Be a man." اس نے کہا تو میں جھنجھلا کر رہ گیا۔

"What does that mean? میں نے شکوہ کیا۔

"I mean, be a Pakistani man, Saleem." اس نے کہا۔

"Oh, so you wanna be a Pakistan woman?"

میں ادھر تھا تو نہیں مگر اتنا ضرور جانتا تھا کہ جینی کچن میں بلش کر رہی تھی۔مجھے خیال آیا کہ جینی کہیں

میرے لیے کوئی گوشت وغیرہ نہ بنادے۔ میں بھاگ کر کچن میں آیا تو جینی کی آنکھوں کو پُرنم پایا۔ صاف ظاہر تھا کہ جینی کسی پختہ رشتے میں بندھنے کا تڑپ تڑپ کر انتظار کر رہی تھی۔

میں نے اسے اپنے سینے سے لگایا اور اس کی پیشانی چوم لی۔ جینی مسکرانے لگی تو میں نے اسے غیر محسوس طریقے سے باور کرایا کہ میرے لیے کوئی سبزی وغیرہ بنا دینا اور اپنے لیے اپنی پسند کی چیز۔ مگر جینی نے کہا کہ مجھے اسے بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ میں یہ گوشت نہیں کھاتا۔ اس نے میڈی سے کب کا پوچھ لیا تھا اور اس لیے آج سبزی ہی بنائی ہے۔

کچھ ہی دیر بعد ہم اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے۔ جینی کے ہاتھ میں کمال کی لذت تھی یا شاید میری زبان پر پڑے پڑ گئے تھے۔ کھانے کی تعریف میں میں نے زمین و آسمان کے قلابے گچ مچ کر کے رکھ دیے۔ جینی نے embarrass ہو کر اِدھر اُدھر کی ہلکی پھلکی باتیں شروع کر دیں اور میں ہاں ہوں کر کے سر ہلانے لگا اور مزے مزے سے کھانا بھی کھاتا گیا۔ میرے موبائل پر میسج کا نوٹیفکیشن آیا اور ساتھ ہی اینا کا میسج سکرین پر نمودار ہوا۔

"Don, my black boy friend, is simply awesome."

میرے گلے میں کوئی بہت بڑی ہڈی سی پھنسنے لگی۔ میں نے کھانسنا شروع کیا تو جینی بھاگ کر پانی لینے گئی۔ موقع پا کر میں نے فون اٹھایا اور "good for you" لکھ کر اینا کو بھیج دیا۔

لنچ کے بعد جینی ساسا ساسی کو کچھ کھلانے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی اور میں نے اپنے کمرے میں آ کر لیپ ٹاپ کھولا اور فیس بک yahoo, gmail وغیرہ پر اپنے اکاؤنٹ کھول کر وقت گزارنے لگا۔ فون کی بیل بجی، میں نے لاک کھولا تو whatsapp پر اینا نے ایک لمبے تڑنگے سیاہ فام ادھیڑ پے کے ساتھ اپنی سیلفی بھیجی تھی، کیپشن تھا:

"With Don who believes man is a sexual animal."

میں نے موبائل ایک طرف پھینکا اور منہ بسور کر بیٹھ گیا۔

'یہ کیا ہے؟ کس بات پر غصہ ہو رہے ہو، سلیم میاں؟' میں نے خود کلامی کی۔ 'ڈان سے

حسد ہو رہا ہے؟ اینا، جینی سے زیادہ پیاری ہے تو کیا ہوا؟ یا زیادہ forgiving ہے اس لیے؟ کیا میں اسے اب بھی چاہتا ہوں؟ کیا میں اسے جینی سے زیادہ چاہتا ہوں؟ اینا کیوں مجھے اپنے بوائے فرینڈز کی نجی باتیں بتاتی ہے؟ کیا وہ بھی مجھے چاہتی ہے؟ اب بھی؟ پچھلے کئی دنوں سے مجھ سے دھتکارے جانے کے باوجود بھی؟'

'نہیں، میں جینی کے ساتھ خوش ہوں اور خدا اسے ڈان کے ساتھ خوش رکھے۔ ہم اچھے دوست ہیں، بس اسی خاطر وہ اپنی خوشی اور غم شیئر کرتی ہے۔ میں نے بھی تو بیچ سڑک کے ہونکنگ کر کے اس کی مسکراہٹ وصولی تھی۔'

اینا کو دل سے اتارنے کے لیے میں نے جینی کو میسج کیا اور کہا کہ آج شام ہم کینڈل لائٹ ڈنر کرنے جائیں گے۔

--☆--

﴿۱۳﴾

مجھے جینی کے ساتھ شان دار کینڈل لائٹ ڈنر کے بعد اُس رات اینا کی ہرگز یاد نہ آتی اگر رات کے ڈیڑھ بجے اس کا میسج نہ آ جاتا۔

"Done something to her?"اس نے بے سیاق پوچھا۔

"To whom?"

میرا پوچھنا تو بنتا تھا۔

"Jenny."

اس نے سوال مکمل کیا تو میری فکر نے مجھ سے جوابی سوال دغوا دیا۔

"What happened to her, Anna?"

"Don't worry, Saleem. Nothing's happened to her. She's just over the moon."

اوہ، اچھا۔ تو یہ بات ہے جینی بے وقوفوں کی طرح سب کچھ اینا کو بتا رہی ہے یا شاید اینا اس کا چہرہ پڑھ رہی ہے۔

"How do you know I'm the reason?"

مَیں نے پُوچھا۔

"Huh. You ask this?"

"I KNOW you both very well."

اوپر تلے اس کے دو پیغامات آئے۔

پھر کافی دیر تک خاموشی رہی۔ اس خاموشی میں پھسل کر میرا دھیان اینا پر چلا گیا۔ بہت دیر تک میں اسے سوچتا رہا۔ سوچوں ہی سوچوں میں ٹٹولنے کا مرحلہ تمام ہوا تو میں یہ سوچنے لگا کہ کیا کبھی اینا میرے دل و دماغ سے نکلے گی بھی سہی؟ یا منزہ کی طرح ہمیشہ میری تنہائی اور محفل میں دھا چوکڑی جما کر بیٹھی رہے گی۔ یہ دونوں تعلق تھے بھی خاصے عجیب۔ ایک بچپن کا اتنا پرانا تعلق کہ مجھے اب منزہ کی شکل تک بھول چکی ہے اور دوسرا اس قدر مختصر تعلق کہ اتنی مدت میں تو صحرا کی کھمبی بھی نہیں پکتی جتنی میں اینا مجھ سے پک گئی۔

"You know what, Saleem?"

خایا چاپٹو، پھر میسج آ گیا اینا کا۔

تو وہ بھی اپنی سوچ کے پچھلے ڈیڑھ دو گھنٹے میرے خیال میں جھونک رہی تھی۔ سوچا جواب نہ دوں۔ وہ یہی سمجھے گی کہ سو گیا ہوں۔ مگر پھر تجسس نے اتنی گدگدی کی کہ ذرا نخرالوپن کے ساتھ لکھا:

"....?"

اینا کو میرے نخرے اٹھانے کی عادت تھی سو اس نے میرے میسج کی سرد مہری کو نظر انداز کیا اور جواباً لکھا:

"In the economy of love, you're a billionaire."

اب مزید Chatting جینی سے Cheating کے مترادف تھی، سو محبت کی معیشت کا بل گیٹس بنتے ہی میں نے موبائل کو سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور لائٹ آف کرنے کے لیے بیڈ سے اٹھ کر دروازے کے پاس لگے بورڈ کی طرف گیا۔ جوں ہی بٹن نیچے کیا، در پر دستک ہوئی۔ بٹن اوپر کر کے لائٹ دوبارہ جلائی اور دروازہ کھول کے دیکھا تو سامنے اینا کھڑی تھی۔ اس نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر مجھے پیچھے دھکیلا، اندر آئی اور مڑ کر دروازہ لاک کر دیا۔ اس کا جسم جل رہا تھا۔

کافی دیر وہ منہ دوسری طرف کر کے وہیں کھڑی رہی۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے مجھے بتایا کہ ڈان بہت ہی humble پس منظر رکھتا ہے، بلا کا کنجوس ہے۔ اپنے ٹوائلٹ پیپر بچانے کے لیے ہر صبح دوڑتا ہوا یونی ورسٹی جاتا ہے اور وہاں کے ٹوائلٹ استعمال کر کے واپس فلیٹ پہ جاتا ہے۔ تاہم وہ اس کے ساتھ نبھا کر لیتی اگر وہ بے کار نہ ہوتا۔ میں نے اس کی بات کو نہ سمجھ پانے پر معذرت کی تو اس نے امریکی زبان کے تمام تر euphemism کو استعمال میں لاتے ہوئے کہا کہ سمجھو ڈان ایک سنگر ہے اور بھری محفل میں گاتے ہوئے اس کا گلا بیٹھ گیا۔

"Who are you, Saleem?"

اس نے اچانک مڑ کر پوچھا۔

"Nothing."

میں نے انکساری کی ایکٹنگ کی۔

"My love."

اُس نے تڑپنے کی ایکٹنگ کی۔

"So your love comes out of nothing."

میں نے کسی کلاسیکی انگریزی ڈرامے کے ایک مکالمے کا کچھ حصہ مستعار لیتے ہوئے کہا۔

"Your restraint is killing me, Saleem."

اس نے چلاتی ہوئی سرگوشی کی۔

"Stop exhibiting this self-control, please."

وہ التجا کرنے لگی۔

"Anna, Anna, Anna ---"

میں گویا بتیس رگیں کٹوائے کھڑا تھا۔

"Jenny and I are gonna marry soon. Wish us good luck,

Anna."

میں نے اُسے خبر دی تو وہ قدرے پیچھے ہٹی اور ڈوبی ڈوبی آواز میں "All the best" بولا۔ آگے بڑھ کر میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور اس کے لیے دروازہ کھولا۔ جب وہ جانے لگی تو میں نے اسے کہا:

"Hey, Anna I must let you know that I think a lot about you and probably I will never be able to forget you. A part of my heart will always remain yours. A part of the romances I ever make will fantasize you."

"Now stop this shit and don't make me cry."

اس نے میرے جذباتی جملوں کو کوس کے کہا اور پلٹ گئی۔

--☆--

جب میں ایم اے کر رہا تھا تو میرے ڈی جی خان کے ایک دوست عامر کو شہر کے سب سے خوب صورت ہیجڑے ایشوریا سے محبت ہو گئی۔ ایشوریا بھی عامر کو دل و جان سے چاہتا تھا۔ دونوں کو ایک دوسرے کی عادت ہوئی تو ایشوریا کے گُرو نے میرے دوست کو اپنے چیلے سے ملنے سے منع کر دیا۔ تاوقتیکہ وہ اس کا ٖگریا بننے پر رضا مند ہو جائے۔ گریا ہیجڑا مکتبِ بدتمیزی کی اصطلاح ہے اور گرو کے فتوے میں اس کی آمد کا مطلب تھا کہ عامر کو اپنے محبوب ہیجڑے سے 'شادی' کر کے گرو جی کا گھر داماد بننا ہوگا۔ ''شادی'' کے وقت پچاس ہزار یک مشت اور بعد میں ہر ماہ کچھ مقررہ رقم گرو کی ہتھیلی پر رکھنی ہو گی۔ ہم سب دوست پہلے تو کئی دن عامر کی اس پریم کہانی پر ہنستے رہے۔ پھر اسے سنجیدہ دیکھ کر فکر مند ہوئے اور سمجھانے لگے؛ خان دان کی پگڑیاں یاد دلائیں۔ اس کی بہنوں کے مستقبل یاد دلائے، آخرت کا واسطہ دیا اور پھر جب اس نے پنکھے سے جُھول جانے کی دھمکی دی تو ہم نے اُس کے آگے سر جُھکا لیا۔ سو ایک روز عامر ہم آٹھ دس دوستوں کی بارات

لے کر ہیجڑوں کے ڈیرے پر پہنچ گیا۔ آگے کوئی سو، ڈیڑھ سو ہیجڑوں کا ایک طوفانِ بدتمیزی برپا تھا۔ سب نے زرق برق لباس پہنے ہوئے تھے۔ تازہ شیو کر کے میک اپ کی پانچ پانچ تہیں جمائی ہوئی تھیں۔ جسے کینوس سمجھ کر پسینہ ایبسٹر یکٹ آرٹ تخلیق کر رہا تھا۔ ہیجڑے لپ سٹک پر زبان پھیر پھیر کر کھائے جا رہے تھے۔ ایک دوسرے سے گفت گو کرتے تو لگتا ابھی کسی بات پر اپنے اپنے پستان نکال لیں گے اور ایک دوسرے کے سروں پر دے ماریں گے۔ تاہم یہ ان کی پیار محبت والی لاؤڈ نس تھی۔ پھر ڈیک پر شادی نمبر چلائے گئے تو عام خسروں نے گروپ میں جب کہ خواص نے اکیلے اکیلے اپنی باری پر آ کر ڈھول برپا کر دینے والا رقص کیا اور خوب داد اور ویلیں لوٹیں۔ رقص و سرود کے بعد ''دلہن'' ہیجڑے کو باہر لے آ کر ایک صوفے پر ''دلہے'' کے پہلو میں بٹھا دیا گیا۔ اسے عروسی لباس پہنایا گیا تھا۔ پھر ہیجڑوں میں اعلان کیا گیا کہ ''بہن'' کو سلامی دیں۔ فوراً سب ہیجڑوں نے ایک قطار سی بنالی اور باری باری آگے بڑھنے لگے۔ ''دلہے'' اور ''دلہن'' کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھ کر میں سراپا حیرت و شرمندگی تھا۔ عجب نظارہ تھا کوئی پانچ ہزار دے رہا تھا تو کوئی دس، کوئی سونے کی بالیاں لایا تو کوئی گلوبند۔ ایک ''پڑھے لکھے'' ہیجڑے نے کاپی لی اور یہ ''سلامی'' نوٹ کرنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ''دلہن'' کے سامنے رکھا ڈبا پیسوں اور زیورات سے بھر گیا۔

مجھے شدید پسینہ آنے لگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ہم کیا کریں گے۔ باقاعدہ سلامی لے کر آنا چاہیے تھا۔ مگر میں تو سمجھا تھا کہ نیچ ذات ہیں ہمارا جانا ہی کافی ہوگا۔ میں نے ذہن پر زور دیا اور سوچنے لگا کہ میرے پاس کتنے پیسے ہیں۔ مگر جوں جوں مجھے مختلف جیبوں میں پڑے پیسوں کی تفصیل یاد آتی گئی میرا حلق خشک ہوتا گیا۔ کل ملا کر پانچ سو انتیس روپے بن رہے تھے۔

اعلان ہوا کہ اب ''دولہا'' ''دلہن'' کو سلامی دے گا جو کم سے کم پچاس ہزار روپے سکہ رائج الوقت ہوگی مگر زیادہ سے زیادہ کی حد دولہے کی خوشی ہے۔ عامر نے ایک ہاتھ سے اپنی ناک کا پسینہ پونچھا اور دوسرے کو شیروانی کی جیب میں ڈالا اور کچھ پیسے نکال کر ایشوریا کی مٹھی میں ڈال

دیے۔ ایشوریا جلدی سے وہ مٹھی اپنے پرس میں لے جانے لگا کہ گرو نے ہاتھ پکڑ کر سارے پیسے لے لیے اور اس پڑھے لکھے ہیجڑے کے حوالے کر کے کہا ''گنو، اری کاجل، اور بتاؤ سب بہنوں کو کہ میرے 'داماد' نے 'کتنے' دیے ہیں۔

فوراً گنتی ہوگئی۔

''دس ہزار......'' گنتی کرنے والے یا والی نے خوف زدہ ہو کر سبھی کو بتایا۔

''دس ہزار......'' منحنی سے گرو نے گرج کر کہا اور اپنے مردانہ سینے پر یوں دو ہتھڑ مارے کہ اس کی توند پھڑ پھڑانے لگی۔ پیروی میں چھوٹے بڑے تمام ہیجڑوں نے اپنی اپنی سینوں پر دو بار یوں فارمیشن میں تھپڑ مارے کہ لگا ہیجڑوں کی پریڈ کا وقت آ گیا ہے۔ پھر کچھ دیر منہ پھٹ ہیجڑوں نے خاموشی کو بولنے دیا۔ گرو آہستہ آہستہ چلتا ہوا ڈی جے کے پاس آ گیا اور مائک اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''کیا سمجھ کر آئے ہو، عامر میاں؟'' اس کے اس سوال کی مجھے اس وقت تک سمجھ نہ آئی جب تک اس نے دوسرا نہیں پوچھ لیا۔

''عورت سمجھا ہے کیا میری ایشوریا کو؟''

گرو پیٹ سمیت پورے جسم کا بھار دائیں ٹانگ پر ڈال کے کھڑا ہو گیا۔

''عورت سمجھتے ہو میری ایشوریا کو؟''

اب کی بار وہ یوں چیخا کہ سبھی ہیجڑوں نے بہ یک زبان ہو کر دوہرایا:

''عورت سمجھتے ہو ہماری باجی کو؟''

اس بات میں ذرا سا وقفہ نہ آتا تو میں جنس کی deconstruction پر جاری اس مشق کو سمجھ نہ پاتا۔

''اس شہر کی سب سے حسین مورت ہے میری ایشوریا۔'' گرو نے شہادت کی انگلی ہوا میں بلند کر کے یوں سرعت سے نیچے کھینچی کہ ہوا میں اِک لکیر سی لگ گئی۔

''سب سے حسین'' سب ہیجڑوں نے گواہی دی۔

''میں چاہوں'' ذرا سے وقفے کے بعد گرو پھر گویا ہوا'' تو اسے کسی لغاری، مزاری سے بیاہ دوں۔'' پھر آواز کو بلند کرتے ہوئے کہا'' ذرا سی کوشش کروں تو یہاں عامر کنگلے کی جگہ عامر لیاقت کو بٹھا دوں۔ مگر مجبوری تھی میری، اسے تیری محبت نے اندھا کر رکھا ہے۔ چاکی ہو چکی ہے تیری اس لیے تجھے ہاں کی۔ کیا کروں ماں ہوں اپنی بچی کو تڑپتا نہیں دیکھ سکتی۔''

اس قدر خاموشی تھی کہ ایشوریا کی ہلکی سی سسکی بھی چیخ لگ رہی تھی۔ ذرا توقف کر کے گرو نے آہستہ سے کہا'' جانتے ہو عامر! ایشوریا، اختر سے ایشوریا کیسے بنی؟ اپنے سگے ماں باپ سے بچھڑ کر آئی ہے میری بیٹی بننے، اپنے رب کو ناراض کر کے گوٹی اُتاری اور فرکا پہن لیا۔'' پھر فوراً ہی درد بھری آواز میں کہا: ''تمھارے جیسے لُوروں کی خاطر اٹھارہ ٹیکے لگوائے واٹل میں تو یہ چھلکے نکلے۔''

اب کی بار گرو نے وضاحتاً پہلے اپنے کولہوں پر تھپڑ مارا اور پھر آگے بڑھ کر ایشوریا کے سینے پر ہاتھ مارا تو ایشوریا شرما سی گئی۔

بہت ہی سوز دار آہ بھر کر گرو نے آہستہ سے کہا: ''اکوی تھی میری ایشوریا۔'' اور پھر اچانک زور سے چلا کے: ''بتیس رگیں کٹوائی ہیں میری بچی نے تو جا کر اس ملک کی سب سے خوب صورت چیٹی بنی۔'' اس نے ہاتھ سے انتہائی فحش اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ کچھ ہیجڑوں کی آنکھیں بھر آئیں اور کچھ کے سینوں میں آگ۔

''اور وہ بھی اس شہر کے سب سے بڑے سرجن سے اور تم اسے گائے سمجھ رہے ہو۔ آسرے کی تلاش میں بیٹھی گائے جو تمھارے ایک اشارے پر تمھارے پیچھے چل پڑے اور پھر گونگی بن کر ساری زندگی تمھارے پاؤں دباتی رہے؟''

پھر گرو اپنے چیلوں اور سہیلیوں سے مخاطب ہوا۔ ''تم سب کیا کہتی ہو، اری لڑکیو؟ تمھاری باجی کو کر دوں اس کنگلے کے حوالے؟''

''نہیں ں ں ں...... '' سب نے بہ یک زباں کہا۔

''نہیں ملے گا اور کوئی میری بیٹی کو؟'' گرو نے پوچھا۔

''ملے گا امی، کیوں نہیں ملے گا۔'' ایک انتہائی مردانہ قسم کے ہیجڑے نے اپنی توند کے نیچے ران کھجلاتے ہوئے کہا۔

''جے زرداری ویکھ لوّے ناں میری باجی نوں، تاں اوں نوں وی لوّ ہو جاوے میری باجی ناں۔'' ایک بہت ہی کمزور سے ہیجڑے نے عامر کی طرف دیکھ کر اپنی مردانہ آواز کو زنانا تے ہوئے کہا۔

''یاں مَران خان'' اس کے پیچھے کھڑے ایک اور نے عمران خان کے تلفظ کو پنجابیا کر نسبتاً بہتر رشتہ پیش کیا۔

ہیجڑوں کے دل چسپ ڈسکورس کے باوجود مجھے اپنے دوست کی بے عزتی اور اپنی ذلت پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ عامر نے ہمت کر کے کہا کہ وہ ہر ماہ دس ہزار روپے دے کر چار ماہ میں ساری رقم ادا کر دے گا۔ اس پر بھی گرو نہ مانا اور ایشوریا سے کہا کہ فوراً عامر کو اس کی نظروں سے دور کرے۔ یہ حکم صادر کر کے گرو ناراض ہوا اور دوسری جانب رخ کر کے پُشت پہ ہاتھ باندھے کھڑا ہو گیا۔ موقع پاتے ہی ایشوریا نے فوراً اپنی بَرا میں ہاتھ ڈالا اور ہزار ہزار کے بہت سارے نوٹ میری مٹھی میں تھما دیے۔ پھر بہت ہی غصیلی آنکھوں سے تمام ہیجڑوں کو دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں تنبیہ کی۔ میں نے اپنی بلوچی غیرت کو بھنگ پلائی، پیسے جیب میں ڈالے اور ہیجڑوں کے سے انداز میں کہا: ''گُرو۔''

گرو فوراً پلٹا۔ میں نے گلا صاف کیا۔

''میں دوں گا اپنے دوست کی جگہ آپ کے پیسے۔'' میں نے ذرا زیادہ اکڑتے ہوئے کہا تو ایک دو ہیجڑوں کی ہنسی نکل گئی۔

''کتنے؟'' گرو نے گرج کر کہا۔

”جتنے آپ کہیں گے، میرا مطلب ہے کہیں گی۔“

”لاؤ دو پھر۔“

میں نے اپنی جیبوں سے سارے پیسے نکال کر گرو کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔ گرو کو شاید گنتی نہیں آتی تھی سو اس نے پھر اسی ہیجڑے کو پیسے دے کر کہا: ”گنتی کر، اری کاجل“۔

”ایک، دو، تین۔۔۔“

گنتی ختم ہوئی تو میں نے اپنی پیشانی پر تھپڑ مارا۔ کل ملا کر پچیس ہزار پانچ سو انتیس روپے تھے۔ میں نے سوچا گرو اب بھی نہ مانا تو فوراً پندرہ ہزار منگوا کر اس کے منہ پر ماروں گا۔ یہ کون سا مسئلہ ہے۔

”گرو پورے پچاس ہزار ہیں۔“ کاجل نے سفید جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

”کل کتنے ہو گئے؟“

”گرو ساٹھ ہزار۔“

”کھانا کھول دو۔“ گرو نے ہاتھ اوپر اٹھا کر چہکتے ہوئے کہا تا کہ دور بیٹھے چڑھوے سمجھ لیں کہ دیگوں سے ڈھکن اٹھا لینے کا وقت آ پہنچا ہے۔ چاروں طرف مبارک ہو، مبارک ہو کی صدائیں گونجیں۔ غیر ہیجڑا افراد کھانے کی طرف دوڑے جب کہ ہیجڑے باری باری آئے اور 'دولہا'، 'دلہن' سے گلے مل مل کر انہیں چومنے لگے۔

لگے ہاتھوں پانچ سات نے گلے لگا کر مجھے بھی چاٹ لیا۔

تین چار نے مجھے اپنے موبائل نمبر بھی دیے۔ ایک تو میرے پاس آ کے ٹِکی ہو گیا۔ مجھے رازداری سے بتانے لگا: ”باجی نے تو بتیس رگیں کٹوائیں میں پیدائشی مورت ہوں، پیدائشی۔“ لفظ پیدائشی پر اس اپنی ہتھیلیاں اس نے زور سے چٹخائیں کہ پاس بیٹھے دُولہے میاں کی چھرکی نکل گئی۔ پھر اس نے شلوار میں ہاتھ مارا۔ اور کافی دیر کے بعد اس کی کسی جیب سے موبائل نکالا، اصرار کر کے اس پر میرا نمبر save کروایا، اور پھر میرے موبائل پر اپنا نمبر درج کروایا ”میرا نام شازیہ چڑیا ہے۔“

محترمہ چڑیا کو معلوم نہ تھا کہ راہِ محبت میں مَیں بہت دور نکل جاؤں گا۔ اسے یہ خبر بھی نہ تھی کہ میرا خیال جس محرابِ محبت میں دوزانو ہو کر بیٹھا تھا، اس کی سمت اٹلانٹک کے اس پار تھی اور آنے والے وقتوں میں میں نے اسی سمت کا راہی بننا تھا۔ وہ سمت جو دس ہزار میل دور مجھے وہاں لے آئے گی جہاں میری محبت تھی، میری جینی۔

--☆--

﴿۱۴﴾

میرے لیے ایک دن جینی ناشتہ بنانے گئی تو میں اس آؤ بھگت پر غور کرنے لگا۔ امریکی الہڑوں سے اس طرح کے سگھڑ رویے کی کبھی کسی نے توقع بھی نہیں کی ہوگی۔ مجھے اچانک خیال آیا کہ میں نے ابھی تک جینی کو کوئی تحفہ نہیں دیا۔ یہ اپنا کا وہ گلہ تھا یا میری جینی سے محبت میں سنجیدگی، جو میرے اس خیال کو میرے تحت الشعور سے نکال لائی تھی۔ بہرحال مجھے جینی کو کوئی بہت ہی منفرد چیز دینی چاہیے۔ قدرے غور و خوض کے بعد سوچا کہ اس تحفے کا پاکستان سے ہونا ضروری ہے۔ سو میں نے فوراً اسلام آباد میں موجود اپنے ایک دوست کو پیغام لکھا کہ مجھے ایک شال بھیجو جس پہ نیلے رنگوں کی کڑھائی ہوئی ہوئی ہو۔ پھر اک بے دھیانی سی میں ایک اور پیغام لکھ کر اپنا کے لیے ایک مفلر بھی کہہ دیا۔ میں یہ دو پیغام بھیج بیٹھا تو وہ ناشتہ لے کر آئی اور ایک ٹوسٹ سے چھوٹا سا پیس لے کر میرے منہ میں دیا۔

جینی دن بہ دن گھر بسانے کے فن میں طاق ہوتی جا رہی تھی۔ ظاہر ہے وہ پاکستانیات کا مطالعہ کر رہی تھی۔ اِدھر وہ اس نصاب میں مہارت حاصل کر رہی تھی، اُدھر میں بھی رفتہ رفتہ اپنی اصل کی طرف مُہاریں موڑ رہا تھا۔ اب کبھی میرا دل کُھسہ پہننے، تہبند اوڑھنے اور حقہ پینے کو کرتا اور کبھی ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر سارا دن بیٹھے رہنے کو۔

جینی کا بی۔ اے۔ میں آخری سال شروع ہونے والا تھا۔ وہ پہلے ہی ایشین سٹڈیز پر کچھ مضامین پڑھ چکی تھی۔ جس سے اسے ایشیا کی مختلف ثقافتوں کے بارے میں کچھ چیزیں معلوم

تھیں۔ اس کے بی۔ اے۔ کے مکمل ہونے کے ساتھ ہی میرا ایم۔ اے۔ بھی مکمل ہونے کو تھا۔ سو ہم دونوں اکٹھے فارغ ہونے جا رہے تھے۔ لہٰذا۔۔۔۔

"A year and we'll be home."

اچانک جینی نے میرے خیال کی ڈوری اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

"Home?" میں نے بھول پن کا مظاہرہ کیا۔

کچھ باتیں اس قدر رسیلی ہوتی ہیں کہ دل تفصیل لینے کو مچل مچل جاتا ہے، تکرار چاہتا ہے، طول ڈھونڈتا ہے، عرض پھلانگتا ہے۔ گہرائی میں اترتا ہے۔ ایسی ہی تھیں جینی کی کچھ باتیں بھی۔ محبت ہمارے ساتھ پُول کھیل رہی تھی۔ کئی زاویوں سے کھیل کر ہمارے دل و دماغ کی گوٹیوں کو ایک ہی ہول میں ڈالے جا رہی تھی۔ ہمارے بھٹکے ہوئے، آوارہ گرد دماغوں کو محبت بھی مل گئی تھی اور اس کے جشن منانے کے لیے منزل بھی۔

"PAKISTAN!" جینی نے میرا ہاتھ دبا کر کہا۔

رس، مَس میں تو تھا ہی مگر لفظ کی شیرینی اس پر سبقت لے گئی۔

"You mean on a honeymoon?" میں نے وضاحت مانگی کہ ابھی کانوں میں تشنگی تھی۔

"I. mean. permanently."

جینی نے مجھے خوشی کے دھچکے سے بچانے کے لیے آہستہ آہستہ کہا۔

"Really? You mean it seriously or just kidding like you did earlier?"

اب کی بار میں گرہ لگانا چاہتا تھا۔

"Certainly! Not kidding" اس نے حتماً کہا۔

میں جست بھر کر کرسی سے اترا اور آگے بڑھ کر جینی کو گلے لگا لیا۔ اس کا ماتھا چوما، اس کا شکریہ ادا

کیا،اس کی آنکھوں میں دیکھ کر ایک بار پھر "Thank you" بولا۔ پھر اس کے پاس بیٹھ کر اسے بتانے لگا: ''تقریباً ایک سال اور دو ماہ میں ہم کاٹھ گڑھ میں ہوں گے، تم میری دلہن بنو گی، مہندی لگاؤ گی، اس سے اپنے ہاتھوں پر 'سلیم' لکھواؤ گی۔۔۔''

''اِن اُرڈُو۔'' اس نے شہد کے سے لہجے میں کہا۔

''جی، اردو میں۔ پھر تم بھاری بھر کم لہنگا پہنو گی، ماتھے پہ جھومر اور کانوں میں کٹورے اٹکاؤ گی، آنکھوں میں کاجل ڈالو گی۔ اُبٹن لگاؤ گی۔''

"What's ubton, Saleem." میں سانس لینے کے لیے رکا تو اس نے پوچھا۔

"It's something that whitens your skin."

اس بات پر وہ ہنسنا شروع ہوئی اور پھر ہنستی ہی چلی گئی۔

"I guess I have to tan it instead!" اس نے اپنے گالوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

میرا دل سجدۂ شکر میں گر گیا۔ خدا نے مجھے ایسی دلہن عطا کی تھی جس کی زندگی میں گوری رنگت کی کوئی فکر ہی نہیں تھی اور یہ ایک ہی فکر تو ہوتی ہے ہماری لڑکیوں کو۔ جس کی وجہ سے ان کی زندگیوں میں ٹی وی ڈراموں سے زیادہ ان کے بیچ کے وقفے اہم ہوتے ہیں۔

--☆--

اس رات کو میرے دماغ کے آنگن میں سوچوں کا ایک قیامت خیز طوفان آیا۔

اگر محبت کی معراج اسی محراب میں ہے جس نے میری تلاش کی سمت متعین کی تھی تو پھر میں یہاں کیوں آیا؟ کیا جینی اپنی محبت کو یہاں celebrate نہیں کر سکتی؟ کیا کچھ لوگوں کی محبت کا مقصود اجنبیت ہوتا ہے؟ کیا محبت کا سرور پراسراریت میں ہے؟ کیا محبت مہاجر ہے؟

محبت کا سوال جوں کا توں دانت نکالے کھڑا تھا۔

شاید یہ سب ایک ڈھونگ تھا یا شاید یہ سارا سفر محض میری انا کا سفر تھا۔ میں گاؤں والوں پر

برتری ثابت کرنا چاہتا تھا۔ علی کو حقیر کرنا چاہتا تھا۔ منزہ کے دادا کے کھسے کا جواب دینا چاہتا تھا اور اس کے لیے جینی سے بہتر لڑکی کون ہو سکتی تھی جس کو ابٹن کی بھی ضرورت نہ تھی۔ مجھے اپنا سوال، اپنی محراب، اپنا سفر، اپنی منزل، اپنی محبت سب بے معانی لگنے لگے اور تو اور مجھے اپنا وجود بھی بے مطلب لگنے لگا۔ رات کے تین بجے تک ایک بات واضح تھی کہ کچھ واضح نہ تھا۔ میری حالت اس بچے جیسی تھی جو گھر کا، اپنے ہی گھر کا راستہ بھول جاتا ہے اور اس کی تلاش میں بھٹکتے بھٹکتے بالآخر قائل ہو جاتا ہے کہ اس کا گھر کوئی تھا ہی نہیں۔ لیکن پھر اس بچے کو اگر زندگی کے کسی موڑ پہ گم راہی کا احساس ہو جائے تو یہ احساس توڑ کے رکھ دیتا ہے۔

عجیب و غریب کیفیات تھیں کہ حملہ آور ٹھہریں۔ میں واپس جانے کا سوچتا تو سفر پہ لگے ماہ و سال ڈوبتے نظر آتے۔ ٹھہرنے کا سوچتا تو جینی کی آنکھوں کے خواب بکھرتے نظر آتے۔ یہاں بھی ادھورا پن، وہاں بھی تشنگی۔ خدایا! مشرق و مغرب کے درمیان کوئی تیسرا جہان کیوں نہیں ہے؟ جہانِ محبت!! جہاں ہم سے پروانے محبتوں کے پھول اگاتے۔ کوئی ایسا جہان جہاں تکمیلِ تمنا ہوتی۔

فکر کے کچھ لمحوں میں نتائج سے زیادہ مسائل کرب ناک ہوتے ہیں۔ جواب سے زیادہ سوال دل خراش ہوتے ہیں؛ ایسا ہی تھا یہ لمحہ بھی۔ ان سوالوں کے بھنور میں حوصلے کی ناؤ پر میری گرفت ڈھیلی پڑنے لگی۔ آنکھیں نم ہوئیں، سانس تیز ہوئی اور پھر کسی بچے کی طرح میں باک بھر کر رو پڑا۔ میرے ساتھ اس جہان کے سبھی بھٹکے ہوئے بچے روئے: پُونم پُروا، آکاش، ستارے، دردنگر کے سبھی استعارے، سب دھاڑیں مار مار کے روئے۔

مجھے اب یاد نہیں ہے کہ میں سو سکا تھا یا نہیں مگر علی الصبح میں اپنے روم سے نکلا، نِک کے بند کمرے کے سامنے سے گزرا اور دائیں ہاتھ پر اوپر کو جاتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ کر اُلٹے ہاتھ پر اپنا کے روم کو چھوڑ کر جینی کے دروازے پر جا دستک دی۔ کوئی چوتھی دستک پر جینی نے آنکھ اور دروازہ کھولا اور پھر مجھے وہاں پا کر منہ بھی۔

"Ohhh...."

میں اندر گھسا اور اپنے پیچھے دروازہ بند کر لیا۔ سامنے ساسا آنکھیں موندے
ساسی میرے گاؤں کی جٹیوں کی سی پھرتی سے جاگ چکی تھی۔

"Is everything alright, honey?"

جینی نے گھبرا کر کہا اور میری آنکھوں کو اپنی آنکھوں سے ٹٹولنے لگی:

"Is everything alright in Pakistan?"

اس کے دونوں سوالوں کو نظر انداز کر کے میں نے اپنا پوچھا:

"Why do you want to go there, Jenny?"

جینی کو کچھ دیر کچھ سمجھ نہ آیا۔ سو ذرا سے وقفے کے بعد کہا:

"I love you and want to do nothing else in my life."

بڑی فضول منطق تھی۔

"Can I tell you something, Jenny?"

میں نے موقع مانگنا چاہا۔

"No. Please, don't stop me from flying to the country of my love."

اس نے میرے منہ پر اپنا صندل سا ہاتھ رکھ دیا۔

--☆--

﴿۱۵﴾

دو تین گھنٹے بعد نہا دھو کر کچن میں گیا تو میڈی کچن میں کام کر رہی تھی۔ ریڈیو چل رہا تھا۔ اسامہ بن لادن یا شاید دہشت گردی پر کوئی پروگرام لگا ہوا تھا۔ میں نے میڈی کو ہائے بولا مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اسی وقت جینی بھی نہا دھو کر گیلے بالوں کو شانوں پر پھیلائے وہیں آ گئی۔ اس نے شیلف سے ایک کپ اٹھایا اور جب میں اپنے کپ میں چینی ملا رہا تھا تو وہ کافی لینے میرے پاس آ کھڑی ہوئی۔ میں نے کافی میکر سے اس کے کپ میں بھی کافی ڈال دی مگر وہ اتنی کم تھی کہ میں اپنے گاؤں کے کسی بچے کو بھی دیتا تو وہ زمین پر لیٹنیاں مار مار کے رونا شروع کر دیتا۔ مگر جینی نے قناعت کا مظاہرہ کیا اور مجھے چینی پکڑانے کو کہا۔ جوں ہی میں ڈبے میں سے چینی کا چمچ بھر کر اس کے کپ میں ڈالنے لگا، جینی نے جھپٹی ماری اور میرا کپ اٹھا کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ میں اس کے پیچھے بھاگا تو جینی نے ہنستے ہوئے "Help! Help!" کہا۔

"Leave her alone." کچن سے میڈی بھاگ کر آئی اور مجھ پر چلاتے ہوئے کہا۔

میں اس کی غضب ناکی کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ وہ میرے پاس آئی اور اپنے ہاتھوں کو میری طرف اُچھال اُچھال کر کہا:

''بن لادن اِن یور کنٹری، پاکستان، نات ایفگانستان''۔ میڈی کا کتا ٹونی بھی مجھ پر بھونکنے لگا۔

"Wait, wait...."

جینی کافی کو ٹیبل پر رکھ کر واپس آئی تو میڈی اس کی طرف مڑی۔

”بن لادن اِن لیبت لیبت نیئر ازلام لیبت ،ہز کنٹری۔“

"What do you want to say, Medi?"

میں نے تنگ آ کر کہا۔

”یُو دونت نو ہی واز اِن لیبت لیبت ؟“

میڈی نے جب یہ سوال کیا تو میرے پاؤں تلے سے امریکا کی اٹھانوے لاکھ مربع کلومیٹر زمین ایک دم سے نکل گئی۔

میڈی جس کے ساتھ میرا رشتہ مسافرت کے علاوہ غریب ملکوں کی شہریت کا بھی تھا۔ جس کے ساتھ میں گھنٹوں گپ شپ کرتا تھا۔ جسے میں نے روٹی بنانی سکھائی تھی۔ اپنے ہاتھ سے پکا کر اپنے ہاتھ سے کھلائی تھی۔ وہ میڈی مجھ سے ایک ایسا سوال کر رہی تھی جس کا پہلا حرف ہی اس امر کا اعلان تھا کہ وہ اب میری کچھ نہیں لگتی۔ اگر میڈی پل بھر میں ترکِ تعلق کر گئی تھی تو اور کیا کریں گے۔ تنہائی اچانک میری آکسیجن نوچنے آ گئی۔ مجھے لگا کہ میں اس شہر بولڈر میں بہت اکیلا ہوں۔ اتنا تنہا کہ خود اجنبیت بھی مجھ سے دور بھاگے۔ آہستہ آہستہ خود کو گھسیٹ کر میں ایک کرسی کے پاس گیا اور اس پر گر پڑا۔

"How would Saleem know that, Medi?"

جینی کو شاید میری حالت پر ترس آیا۔ وہ میرے پاس آئی اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سہلایا اور میڈی سے مخاطب ہوئی۔

"Medi, Saleem has been here." جینی کی اس معصومانہ سی وضاحت پر میڈی تو ٹل گئی پر مصیبت نہ ٹلی۔

اگلے تین دن تک ہاسٹل کے منیجر سمیت تمام لوگ پہلے تو مجھ سے ذرا دور دور رہے اور پھر مجھ سے وہی سوال کیا جو میڈی نے کیا تھا۔ فرق یہ تھا کہ میڈی نے دوٹوک بن لادن کو چھپانے کی ذمہ داری مجھ پر ڈال دی جب کہ باقی خواتین و حضرات نے ڈسکورس کا سہارا لے کر، گھما پھرا کر، بہتر

لہجے میں محتاط طریقے سے کچھ سوال کیے جن کی تاثیر اتنی ہی کڑوی تھی۔

"Saleem, where do you live in Pakistan?"

"Nowadays my family is in Islamabad."

"Is Abbotabad very near to your town?"

"Yes, but it's another province, and also the mountains in between...."

"Could have been dangerous for you as well. But how frequently did you visit Abbotabad?"

"Once in a blue moon."

"Did you ever go to this part of the town where Bin Ladin was hiding."

"No."

"Good for ya."

"Don't you think, Saleem, Pakistan army knew or, may be, facilitated his stay in Abbotabad?"

"No. I don't think so. Had they known or facilitated it, American troops would not have reached him. Never."

"Oh. Okay."

"Why do you think Obama shouldn't be mad at your government?"

"No one should be mad at the democratically elected

government of a sovereign state."

تنہائی ہمیں تنہائی میں اتنا نہیں ڈستی، جتنا محفل میں۔ تاہم اکیلے میں مَیں اس تنہائی سے جتنا خوفزدہ ہوتا تھا محفل میں اپنے سوال برداروں کے روبرو اتنا ہی دلیر ہو جاتا۔ اگرچہ میرے جوابوں میں جرأت اور جذباتیت تو تھی مگر استدلال نہ تھا بالکل ویسے ہی جیسے میرے ان سابقہ دوستوں کے سوالوں میں نہ تھا۔

چینی لڑکی 'یون' سے لے کر کولمبین بھائی ہاویئر تک سبھی نے مجھ سے اُسامہ کو چھپانے کا حساب مانگا۔

--☆--

''ماسٹر جی!!!!!'' ایک شام کو میں کارنر روم میں تنہا بیٹھا تو میرے بچپن کے استاد مجسم ہو کر میرے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

''ماسٹر جی! کاش آپ مجھے سوالِ محبت نہ تھماتے۔ کاش میں محرابِ محبت میں نہ بیٹھتا۔ کاش میں تلاشِ محبت میں نہ نکلتا۔ کاش میں اپنی ساری فکر دلیلِ محبت میں نہ بوتا۔ اپنے آنسوؤں سے شجرِ محبت کو سیراب نہ کرتا رہتا تو شاید آج اس قابل ہوتا کہ لوگوں کے سوالوں کا بہتر جواب دے پاتا۔ مگر اب ماسٹر جی میرا کیا لینا دینا سوالِ سیاست سے؟ یہ سبق تو مجھے آپ نے پڑھایا بھی نہیں۔ ہماری دنیا کے اہم ترین سوال پر غور کرنا تو آپ نے سکھایا ہی نہیں۔ ماسٹر جی، آپ مجھے سیاست کی جستجو دے دیتے۔ پھر مار مقابلے کا کمانڈر ہی بنا دیتے۔ مجھے کچھ تو سلیقہ ہوتا کہ اُس کو نبھانے کا۔ کیا ملا آپ کو مجھے یہ بےعمل کر دینے والا سوال دے کر؟ میری رگوں میں بلوچ خون دوڑتا ہے اور اس خون کو آپ کا سوالِ محبت وائرس بن کر کھاتا ہے۔ اب مہربانی کیجیے، یہاں سے اٹھیے اور بتایئے جا کر ان سب بولڈر والوں کو کہ میرا شاگرد دراصل ایک ایسی جنس کا بیج تلاشنے آیا ہے، جس کو بونے سے دھرتی پر نہ ڈرون اتریں، نہ کارپٹ بم۔ نہ اس دھرتی کے ٹاوروں سے

جہاز ٹکرائیں، نہ میزائل۔ نہ اس عالم میں بندوق رہے نہ نفرت سے اٹھنے والی انگلی۔

مگر ماسٹر جی، آپ کہیں بھی تو کوئی مانے گا تھوڑی؟ یہاں محبت کی غیر حقیقی شریعت کا ایک بھی ماننے والا نہیں۔ سب کدورتوں کے خداؤں کے پجاری ہیں۔ کیوں کہ حقارتیں ہی حقیقت ہیں میرے زمانے کی۔ اور میری حقیقت ناشناسی کی وجہ سے تمام عالم کے حقیقت پسند مجھ سے دور جا بیٹھے ہیں۔ سارا بولڈر مجھ سے اجنبی ہو گیا ہے، سوائے جینی کے۔''

یہ جینی کہاں چلی گئی؟ میں کارنر روم سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا اور کچھ توقف کے بعد پاکستان سے لائے ہوئے بیگوں کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ ایک جیب سے مجھے وہ تسبیح ملی جو میری ماں نے اسی طرح کے کسی دن کے لیے رکھی تھی۔

ماں وہ بصیر ہوتی ہے جو سُکھی ایام کی تیاریوں کے ساتھ ساتھ غم کے لمحوں کا سامان بھی جوڑتی رہتی ہیں۔

مجھے تسبیح پڑھے ایک زمانہ بیت چلا تھا۔ پھر بھی میں نے کئی تسبیحیں پڑھ ڈالیں۔ سب سے زیادہ میں نے "سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم" اور "نصر من اللہ وفتح قریب" کا ورد کیا۔

--☆--

اگلے چند دن بھی The Skies کا آسمان مجھ پر نامہربان رہا۔ میں ہال میں داخل ہوتا تو سب آدھی ادھوری مسکراہٹ دیتے۔ دور دور سے "hi" بولتے اور آہستہ آہستہ غائب ہونے لگتے۔ نِک نے ہال میں آنے کی اپنی ٹائمنگ یوں بدلی کہ ان سارے دنوں میں نظر ہی نہ آیا۔ اینا سامنے تو ضرور آتی مگر پھر فوراً یوں غائب ہوتی جیسے راہ و رسم تو کبھی تھی ہی نہیں۔ مجھے پُول کھیلنے کے لیے کوئی ساتھی نہ ملتا۔ خالد اب نہ مجھ سے TOEFL پڑھنے آتا، نہ میرے ساتھ پریزنٹیشن کی ریہرسل کرتا اور نہ ہی GRE کے tips لیتا۔ میں کچن میں جاتا تو میڈی میوزک کی آواز اونچی اور نظریں نیچی کر لیتی۔

ایک امر اطمینان بخش تھا۔ باقی سب لوگ جس قدر دور ہوئے جینی میرے اتنا ہی قریب آئی۔ میں اب روم سے کم کم ہی باہر نکلتا تھا اس لیے جینی میرے کمرے میں زیادہ کثرت سے آنے لگی تھی، ہاسٹل کے اصولوں کو نظر انداز کرتے ہوئے۔ وہ اندر آتی تو میں جلدی جلدی تسبیح مکمل کر کے ایک طرف رکھتا۔ وہ مسکرا دیتی اور مجھے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق سمجھاتی کہ سلیم اس سب کی وجہ میڈیا ہے۔ لوگ حقیقی زندگی اور سکرین کے تصنع میں فرق نہیں کر پاتے۔ اس نے مجھے یہ بھی کہا کہ مجھے ڈائننگ ہال میں زیادہ کثرت سے جانا چاہیے تا کہ لوگ میری افسردگی کو بن لادن کے مرنے پر سوگ سے تعبیر نہ کریں۔

--☆--

میں نے جینی کی بات مانی اور ایک شام کو ڈنر کے لیے ڈائننگ ہال کی سب سے بڑی میز پر جا بیٹھا۔ کرس، جمی، نک، بینگ، للی، یون، مونا، چندن وغیرہ سمیت کوئی تیرہ، چودہ لوگ وہاں پہلے ہی براجمان تھے۔ یہ وہی ٹیبل تھا جس پر ادب اور فلسفے پر کئی بار بحث کر کے میں اپنے ہاسٹل فیلوز کو متاثر کر چکا تھا۔ میں وہاں جا کر بیٹھا تو سبھی مجھ سے نادم، نظریں چرانے لگے۔ 'شاید انھیں احساس ہو گیا ہے کہ انھوں نے میری دل آزاری کی ہے'، میں نے سوچا۔ اس سے میرا اعتماد بڑھا۔ جینی ہال میں داخل ہوئی تو وہاں کھانا کھاتے چالیس پچاس لوگوں میں مجھے سکین کرنے لگی۔ میں نے ہاتھ اوپر کر کے اس کو اپنی پوزیشن بتائی اور اپنے پاس پڑی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے او کے بولا اور ایک ٹرالی کی طرف کھانا ڈالنے چلی گئی۔

"Bring me a piece of fish and a lot of salad, Jenny."

میں نے اونچی آواز میں کہا تو ہال میں بیٹھے سبھی لوگ مجھے دیکھنے لگے۔

"I thought Muzlims don't eat fish." نک نے اپنی جہالت کا اظہار کیا تو مجھے بہت غصہ آیا۔ نک، میرا دوست، پول پارٹنر اور کسی قدر شاگرد بھی، میری اس شناخت کو سوال رہا تھا جو اس وقت کے سیاق و سباق میں ایبٹ آباد کے علاوہ کہیں نہیں جڑتی تھی۔

میں نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا، نک کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُسے بتایا کہ یہ اس کے فکر کرنے کی بات نہیں تھی اور اسے اپنے کام سے کام رکھنے کی ضرورت تھی۔ جب جینی ٹیبل پر آئی اس وقت سب خاموشی سے اپنی اپنی پلیٹوں اور معدوں کے بیچ فاصلے لپیٹنے میں لگے ہوئے تھے؛ میں مسکرا رہا تھا۔ جینی آ کر میرے پاس بیٹھی اور سب کو دیکھ کر پوچھنے لگی کہ اس قدر خاموشی کیوں ہے، ڈائیلاگ ٹیبل پر۔ سب نے کہا کہ کچھ خاص نہیں، بس ویسے ہی۔ ''جھوٹ،'' میں نے کہا اور جینی کو بتایا کہ نک ہمارے تصور حلال وحرام کو حقیر سمجھتا ہے۔ اس نے ابھی اسی قسم کا سوال کیا مجھ سے، جس پر میں نے اسے اپنے کام سے کام رکھنے کو کہا تو سب کو بُرا لگا۔

جینی نے نک کو گھور کر دیکھا اور آہستہ سے کہا: ''نک!'' اور پھر ذرا ٹھہر کے توقف سے پوچھا:

"Which news channel are you watching, Nick?"

"Fax"

نک نے بڑی معصومیت سے اپنی جہالت کا ماخذ بتایا تو ٹیبل کے دوسرے کونے پر بیٹھے بھاری بھرکم ادھیڑ عمر کرس کو روایتی ہنسی کا دورہ پڑا۔ بہت لمبے تڑنگے قہقہے کے انجام پر اس نے سانس بحال کرتے ہوئے کہا:

"As if others are any good. Oh my fu**ing..., American media will drive us all crazy."

کرس زیادہ پڑھا لکھا امریکی تو نہ تھا مگر باتیں سٹیفین ہاکنگ سے بھی زیادہ عقل مندی والی کرتا تھا۔ وہ محب وطن اور باشعور امریکی ہونے کے ناطے امریکہ کی قیادت میں لڑی گئی تمام جنگوں کا مخالف تھا۔ زیادہ سوچنے کی وجہ سے اس کی دماغی حالت خاصی غیر متوازن ہو چلی تھی لہٰذا اب وہ ہر ماہ ہزار بارہ سو ڈالر کی دوائیاں اپنی ذہنی صحت پر خرچ کرتا تھا۔

"Fu**."

اس نے یوں آہستہ سے کہا جیسے کہہ رہا ہو 'دُھر'۔ اور ایک بار پھر ہنسنے لگا۔ اسی دوران نک نے

میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"I am sorry, Saleem." اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "I didn't mean to hurt you."

"We were all sorry for kinda ostracizing you." پینگ نے کہا۔ "But you should have come to the dialogue table earlier."

جمی نے کہا۔

اس پر میں نے انھیں بتایا کہ ''میں نے تم لوگوں کے تمام سوالوں کے جواب دینے کی مقدور بھر کوشش کی تھی لیکن تم سب کی عقل پر یوں اچانک پردہ پڑا کہ تم لوگوں نے لمحہ بھر میں ہی مجھے اجنبی کر ڈالا۔ تم لوگوں کے شکوک اس قدر زہر آلود تھے کہ میرے پاس خاموشی کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ تمہارے رویے ذرہ بھر بھی دانش مندانہ ہوتے تو میں تمہارے پاس بیٹھ کر باتیں کرتا مگر چوں کہ تم میں سے اکثر بالکل بچگانہ حرکتیں کر رہے تھے لہٰذا مجھے یہی مناسب لگا کہ تم سے الگ ہو کر بیٹھ رہوں۔ مگر شکر ہے کہ جینی میرے پاس تھی'' میں نے اس کو گلے لگاتے ہوئے کہا، ''ورنہ میں شاید پاگل ہو جاتا۔'' میں نے انھیں یہ بھی بتایا کہ اب شاید میں دوبارہ کبھی اس ہاسٹل میں اتنا اپنا پن محسوس نہیں کر سکوں گا جتنا گزشتہ تمام وقت میں کیا تھا۔

کرس نے مجھے یقین دلایا کہ ہم سب آپ کے دوست ہیں اور حکومتوں کے معاملات دوستوں کے معاملات سے مختلف ہوتے ہیں۔ سو ہم آپ کو ہمیشہ اپنا دوست سمجھتے ہیں۔ ہم پوری کوشش کریں گے کہ آپ کو وہ اپنا پن لوٹا سکیں جو ہماری غفلت سے کھو گیا۔

اس رات کو بہت دن بعد مجھے اچھی نیند آئی اور مکالمے پر میرا ایمان قدرے بحال ہوا۔

مگر کچھ چیزیں ویسی نہ ہوئیں جیسی میں چاہتا تھا۔ مثلاً میں جب بھی کچن میں جاتا میڈی کی نگاہیں میرے تعاقب میں رہتیں۔ اس نے میری ہفتہ وار صفائی کی ڈیوٹی بھی اتوار سے بدل کر

جمعرات کو کر دی تھی تا کہ میں ڈھیر سارے لوگوں میں کام کروں اور کچن میں اکیلا نہ جاؤں۔

اب میں نے مذاقاً تمام ہاسٹل والوں کو چھیڑنا بھی شروع کر دیا تھا۔ میرے مذاق پر وہ بہت ہی خوف زدہ سا قہقہہ لگاتے اور کھڑے ہوتے تو ایک قدم پیچھے ہٹ جاتے اور بیٹھے ہوتے تو سمٹ سے جاتے۔ میڈی کو چوں کہ چھوٹا موٹا مذاق اثر نہیں کرتا تھا لہٰذا اُسے چھیڑنے کے لیے کبھی میں تیز تیز چلتا کچن میں جاتا اور اسے وہاں اکیلا پا کر اُونچی آواز میں پوچھتا: ''چھُرا کہاں ہے؟ چھُرا کہاں ہے؟''

''وائے'' میڈی کی آواز پھنس جاتی اور نظر دیوار پر لٹکی چھوٹی بڑی چھریوں پر ٹک جاتی۔ پھر فوراً اسے اپنا کتا ٹونی یاد آ جاتا اور کھانے کو چولہے پر جلتا چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلی جاتی اور اس وقت تک واپس نہ آتی جب تک میں وہاں سے چلا نہ جاتا۔ اسے سو فی صد یقین تھا کہ میں اسے چھیڑتا ہوں۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ میں اس کا بہترین دوست ہوں۔ مگر اس کے دل کے کسی بہت ہی گہرے گوشے میں ذرا سا ایک خوف تھا جسے اَن جانے میں وہ میرے ساتھ جوڑ بیٹھتی تھی۔

ایک بار میں کچن میں گیا اور میڈی سے کہا کہ مجھ سے گلے ملو۔ میڈی نے آں اوں تو کی مگر میں نے زبردستی اسے گلے لگا لیا اور اس چھوٹے سے قد کی نفیس فلپائنی خاتون کو بتانے لگا کہ وہ اس دنیا کی سب سے اچھی کُک ہے اور میری دوست بھی اور یہ کہ میں جانتا ہوں کہ میرے لیے علاحدہ سبزی خوروں والا کھانا بنانا کتنا مشکل ہے اور یہ کہ میرا خیال رکھنے کے لحاظ سے وہ میری ماں جیسی ہے۔ اس لیے مجھے دیکھ کر اُس کو کچن سے کھسک جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

میری تقریر کے اختتام پہ میڈی مسکرا دی۔

--☆--

بن لادن کے واقعے کو کافی دن گزر گئے تو میں نے ایک دن ایک اجنبیت ٹسٹ لینے کی ٹھانی۔ شام کے وقت جب میڈی کچن میں کھانا تیار کر رہی تھی تو میں گنگناتا ہوا کچن میں داخل ہوا۔ میڈی کو ہائے بولا اور گلے ملنے کی کوشش کی لیکن وہ کسی کنواری لڑکی کی طرح شرما کر سمٹی اور

میری گرفت سے بچ نکلی۔ پھر میں نے ہاتھ آگے بڑھا کر ملانے کی کوشش کی مگر وہ اب بھی چھوئی موئی بنی رہی۔ میں نے ہنستے ہوئے شکوہ کیا کہ میڈی مجھے آپ سے یہ توقع نہیں تھی۔ میڈی نے فریج سے گوشت نکالا اور میرے ہاتھ میں چھری پکڑا کر اسے کاٹنے کو کہا۔ یہ میرے سوال کا جواب بھی تھا اور میرا امتحان بھی۔ میڈی چھری دے کر مجھ پر اعتماد بھی کر رہی تھی اور حرام گوشت کٹوا کر میری commitment کا اندازہ بھی لگا رہی تھی۔ میں گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرنے لگا اور میڈی کو جانوروں اور مرغیوں کو ذبح کرنے کا صحیح طریقہ بھی بتانے لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ مرغی کو اگر ذبح کرنے کے بجائے سر پر ہتھوڑا مار کر چھیل لیا جائے، جیسے یہاں ہوتا ہے تو اس کا گوشت خون کی آلائش سے پاک نہیں ہوتا۔ اسی لیے بہت سی ذہنی و جسمانی بیماریوں کا موجب بنتا ہے۔

''امائزکن مور ہیلدی دَین پاکستانی''۔ اس نے اپنی منطق بتائی تو میں ہنس دیا۔ میں نے گوشت بنا لینے کے بعد میڈی سے کہا کہ میں وہ پاکستانی شربت بنانا چاہتا ہوں جس کا ذکر میں نے اس سے ایک آدھ بار کیا تھا اور جس کا بنیادی جزوِ ترکیبی چند ہفتے قبل مَیں کسی ایشیائی دکان سے لے آ کر اُسے دے چکا تھا۔ وہ خاموشی سے ایک الماری کی طرف گئی اور جیب سے چابی نکال کر اسے کھولا اور وہاں سے تخمِ بلنگو لا کر مجھے پکڑا دیا۔

میں نے ہاتھ دھوئے، تخم بلندو کو ایک کپ میں بھگویا، ایک بڑے سے دیگچے میں پانی بھرا، اس میں چینی ملائی، برف ڈالی، کپ سے تخم بلندو ڈال کر مکس کیا اور پھر اس شربتِ سلیم کو ایک بڑے کین میں ڈال کر ڈائننگ ہال میں لیموں پانی والے کین کے پاس ہی رکھ دیا اور سامنے بڑی سی چٹ لگائی جس پر لکھا:

"Saleem makes syrup Tukhm-e-Bilandu: A folk drink from Pakistan :)"

ڈنر لگا تو میں سب سے پہلے ہی جینی کو لے کر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ ایک ایک کر کے سب

آنے لگے۔ کھانا ڈال کر اپنی اپنی پسندیدہ کرسیوں کے سامنے جا رکھتے پھر گلاس اٹھا کر میرے کین کے پاس جاتے، شربت ڈالتے ہوئے بے دھیانی سے نیچے لکھی تحریر کو پڑھتے اور جوں ہی آخری لفظ پر نظر پڑتی جھٹ سے ٹوٹی بند کر دیتے اور جو شربت ڈال چکے ہوتے اسے کچن میں گرا آتے یا پھر مروتاً چکھ ہی لیتے۔ میرے امریکی دوستوں کو پاکستان کے بلندو کا ایک ایک تخم ایٹم بم لگ رہا تھا۔ وہ اپنے معدوں کو اس weapon of mass destruction سے ہر قیمت پر محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔

آج تہذیبوں کے تصادم کا فلسفہ میرے آگے دانت نکالے کھڑا تھا۔

لیکن میں کثیر الثقافتیات کو ناکام ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس تخم بلندو کی مدد سے تو میں بس امریکا کی مٹی کوٹسٹ کر رہا تھا۔ اصل مرحلہ تو آگے تھا۔ جس میں مَیں نے تخمِ محبت لگانا تھا۔ جینی سے ہونے والے میرے بچے نے سیاہ بال لہرا لہرا کر ایم آئی ٹی جانا تھا اور فلسفۂ تصادم کے خالق کو ہنر آنکھ مار کر پوچھنا تھا: ''اب بولو، ڈاکٹر ہنٹنگٹن! تہذیبیں متصادم ہیں یا معانق؟''

میری شرارتی حس پھڑکی اور میں وہاں سے اٹھا۔ کیبینٹ سے کوئی دو درجن گلاس نکال کر ان میں اپنا شربت بھرنے لگا۔ جب سارے گلاس بھر گئے تو میں نے پاکستان کی بسوں میں شربت بیچنے والوں کی طرح آوازیں لگانا شروع کر دیں۔ مختلف ہاسٹل فیلوز کو نام لے لے کر پکارنے لگا اور ساتھ میں مخول بھی کرنے لگا کہ ''یہ دَم کیا ہوا شربت ہے۔ جس نے بھی پیا میڈی کی طرح شانت ہو جائے گا یا کرس کی طرح قہقہہ باز ہو جائے گا۔ آیئے آیئے، پہلے آیئے پہلے پایئے۔ یہ شربت پیار کو پانے، امتحان میں A گریڈ لینے، صدا جوان رہنے اور امیر بننے کے خواہش مندوں کے لیے اِک پھک ہے۔ دائمی قبض، مردانہ کمزوری اور لیکوریا کا علاج ہے، ہر قسم کی خارش کے لیے اکیسر ہے۔'' اینا جو کافی دیر سے آگے جھک کر اپنی کمر کھجلا رہی تھی فوراً سیدھی ہو کے بیٹھ گئی۔

کچھ مزاح کے اثر میں تو کچھ میرے اعتماد کے زیر اثر جب کہ کچھ لوگ مروتاً آئے اور باری باری میرا دم کیا ہوا شربت اٹھا کر پی لیا سوائے ایک آدھ لڑکی کے جو ڈائٹنگ پر تھی اور چینی سے

پرہیز کی بہ دولت اس نعمتِ پاکستان سے محروم رہنے پر مجبوری کا اظہار کر رہی تھی۔

شربت کی سبیل سے اچانک میری نظر میڈی پر پڑی۔ میں نے دیکھا کہ آج اس سے چکن نہیں کھایا جا رہا تھا۔ بوٹیوں سے بھری پلیٹ اس کے سامنے پڑی تھی۔ وہ کبھی اس کے اردگرد پڑا سلاد منہ میں ڈالتی، کبھی ڈکار لیتی، کبھی میری طرف دیکھتی۔ کبھی ایک بوٹی کو توڑتی، اسے غور سے دیکھتی، پھر ملامتی نظروں سے مجھے دیکھتی اور سلاد میں سے کچھ اٹھا کر منہ میں ڈال لیتی۔ مجھے اس پر ترس آیا کہ میں نے اس کو ذبح کرنے کا طریقہ اور اس کے فوائد بتا کر اس سے گوشت تقریباً چھین ہی لیا۔

میں نے اپنے شربت کے فوائد ایک مرتبہ پھر گنوائے اور میڈی کو پکار کر کہا کہ میرا شربت appetizer کا کام بھی کرتا ہے۔ اسے پی لینے کے بعد ہر طرح کا گوشت اچھا لگنے لگتا ہے۔

ابھی باقی لوگ میری بات کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہے تھے کہ میڈی اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اونچی آواز میں بولی:

''یُو اِیت مائی چکن، آئی درنک یور درنک۔'' آپ ہی اپنے دام میں سلیم آ گیا۔ میڈی میرا شربت پینے کے بدلے میں مجھ سے چکن کھانے کا مطالبہ کر رہی تھی۔ میں پھنس چکا تھا۔ مجھے میڈی سے اتنی چالاکی کی امید نہ تھی۔

"Done." میں نے آہستہ سے کہا۔

پھر آگے جا کر میڈی سے اس کی پلیٹ لی، اور اس میں سے مرغی کا ایک پیس کھانے لگا۔ ادھر میڈی نے میرے ہاتھ سے شربتِ پاکستان لے کر غٹ غٹ کر کے پینا شروع کر دیا۔ سب لوگوں نے 'ہُرے' کہا اور تالیاں بجانا شروع کر دیں۔ جیسے ان کی آنکھوں کے سامنے اس دنیا کی کوئی ناممکن بات ممکن ہو گئی ہو۔

جیسے ملا عمر نے اوباما سے پگڑی بدل لی ہو۔

ابھی میں نے آدھا پیس ہی کھایا تھا کہ میرا دماغ چکرانے لگا۔ امریکی چکن میرے معدے

سے اچھل کر میرے منہ تک آیا، میرے منہ سے اُبکی کی آواز آئی۔ بھاگ کر میں ہال سے نکلا اپنے پیچھے کرس کا قہقہہ سنا (جواب کی بار بھی "Fu**" پر منتج ہوا)، اور کوریڈور سے ہوتا ہوا اپنے روم میں آیا۔ باتھ تک پہنچتے پہنچتے میری آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں اور ماتھا پسینے سے شرابور۔ میں نے کموڈ پر قے کی اور سنک پر ٹھنڈے پانی سے منہ دھویا اور کافی دیر تک دھوتا ہی رہا۔ دماغ نے دوبارہ کام شروع کیا تو سوالوں کا ایک غول اتر آیا۔

یہ مجھے کیا ہوا تھا؟ جب اس ہاسٹل کے پچاس اور لوگ یہی چکن کھا سکتے ہیں تو میں کیوں نہیں کھا سکا؟ مجھے یاد تھا کہ وہ پیس سافٹ تھا، ذائقہ بھی اچھا تھا، پھر میں نے یہ کیا کیا؟ کیا وہ میرے جیسے نہیں ہیں؟ کیا میں ان جیسا انسان نہیں؟ کیا میری ترکیب میں کچھ فرق ہے؟ مجھے ایک کوٹیشن یاد آئی جو میں نے کچھ عرصہ قبل کہیں پڑھی تھی:

"The same boiling water that softens the potato, hardens the egg. It's not about the circumstances, but rather what you are made of."

کیا میرے یہ روّیے دائمی ہیں؟ کیا میرا رنگ اتنا پختہ ہے کہ میں چاہ کر بھی یہاں کے رنگ میں کبھی نہیں رنگ پاؤں گا؟ کیا میری زبان کے لہجے کی طرح میری کھانے کی پلیٹ بھی ہمیشہ میری شناخت کی چغلی کھاتی رہے گی؟ کیا میرا معدہ میرے بدل جانے پر بھی میرے ملک کے مولویوں کی طرح کٹر رہے گا؟

کچھ عرصہ قبل تک میں کتنا خوش تھا۔ پاکستان کی خون آلود گلیوں سے دور امریکا کی باہوں میں جھومتا ہوا، اس کی سُوندھی مٹی کو دل و جان سے چاہنے لگا تھا، اس کی فضا کو صحتِ روح کے لیے لازم گردانے لگا تھا، اس دھرتی کو اپنی دھرتی ماں ماننے لگا تھا۔ مگر جوں ہی اس کے ہاں سے اپنے حصے کی دھاریں پینا چاہیں، اس کی چھاتیوں نے کچھ ایسا اُگلا جو میرے انہضام میں نہ آیا۔

--☆--

مجھے پاکستان بہت شدت سے یاد آنے لگا جہاں دہشت گردی کی ایک نئی لہر شروع ہو چکی تھی۔ امریکی ڈرون حملے بہ کثرت ہونے لگے تھے۔ میں جب بھی فیس بک کھولتا میرے لوگوں کی لہو آلود تصویریں نظر آتیں؛ میرا خون کھولنے لگتا۔ وطن کی محبت سب محبتوں پر غالب آ جاتی۔ جی کرتا اُڑ کر پاکستان چلا جاؤں اور جا کر اس کی حفاظت پر مامور ہوں۔ لوگوں کی حفاظت کروں۔ کم از کم مدرسوں اور سکولوں کے بچوں کے آنسو تو صاف کروں۔ ان کی ماؤں کے نفسیاتی امراض کا علاج تو کراؤں۔ یا امن پسندوں کے جرگوں میں جاؤں۔ دہشت گردی اور ڈرونوں کے خلاف تحریکیں چلاؤں۔ کچھ تو کروں ظلمِ ناروا کو روکنے کے لیے۔

پھر کسی حقیقت پسندانہ کیفیت میں لوٹ کر سوچتا کہ میرے لیے ان میں سے کسی بھی خواب کو جا لینا ممکن نہیں ہے۔ کیوں کہ میری زندگی کی حقیقت ایک غیر حقیقی سوال کا پیچھا کرنے تک محدود ہو چکی ہے: محبت کو تلاشنا، اس کی سَت رنگی کو اوڑھنا، اس کی خوش بوؤں سے معطر ہونا، اس کی سیم کو لکھنا، رسیلے ذائقوں کو چکھنا اور اس کی بوند بوند سے پیاس بجھانا۔ خدائے محبت کی اس تخلیق کی تمام تر معنویت کا مطالعہ کرنا۔ بس یہی تو کرنا تھا میں نے۔ اپنے آپ کو پانے کے لیے۔ اپنا آپ صفحۂ کائنات پر رسید کرنے کے لیے۔

--☆--

میرے اندر خواب اور حقیقت کی کشمکش جاری ہی تھی کہ ایک روز میں نے انٹرنیٹ پر ایک نیوز رپورٹ پڑھی یا تو لکھنے والا کوئی کہانی کار تھا اور یا یہ واقعہ تھا ہی اس قدر افسانوی کہ یہ رپورٹ مجھ میں گھاؤ پر گھاؤ کرتی چلی گئی۔ یہ ایک ہی دن میں ہونے والے دو حملوں کے بارے میں تھی۔ میرے شہر کے ایک اسکول پر خود کش حملہ ہوا تھا اور ایک قبائلی شہر کے ایک مدرسے پر ڈرون حملہ۔ دونوں میں مارے جانے والوں میں سے زیادہ تر کی زیادہ سے زیادہ عمریں تیرہ چودہ برس کی تھیں۔ نامہ نگار نے بموں کے حجم اور شدت کا موازنہ چھوٹے چھوٹے بچوں کے جسموں سے کرتے ہوئے لکھا کہ لواحقین نے ہر بچے کے نام کی قبریں تو کھود لیں مگر ان میں لے جانے کے

لیے ان کے پاس بم کے کچھ ٹکڑوں پر لگے گلابی گوشت کے لوتھڑوں کے علاوہ تھا کچھ نہیں۔

میں ابھی ان بموں کے پہلوؤں میں مدفون بچوں کے کتبوں پر غور ہی کر رہا تھا کہ بہت عرصہ بعد گاؤں سے علی کی کال آئی۔

’’یار سلیم بھائی‘ آپ کا دوست سادہ مر گیا ہے۔‘‘ دلیل آئی علی کو بتاؤں کہ سادہ میرا دوست نہیں تھا۔ وہ تو مجھ سے نفرت کرتا تھا۔ مالی تقسیم نے شروع دن سے ہی ہمیں سماج کی دو الگ صفوں میں کھڑا کر دیا تھا۔ جن میں پیچھے والی صف کے اقامتی کچھ عرصہ تو اک آس سی میں رہتے ہیں مگر جب آگے والے پلٹ کر نہ دیکھنے کی سوگند کھا لیتے ہیں تو سمتیں مخالف ہو جاتی ہیں۔

’’اوہ، کیسے؟‘‘ میں نے زیر لب انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ کر افسردگی سے کہا۔

’’ڈرون حملے میں۔ اس کے مدرسے پر حملہ ہوا۔ اللہ میاں سے جا ملا۔ بم اتنا ظالم تھا کہ اس کا لاشا ریزہ ریزہ ہو گیا۔ صندوق میں لایا گیا۔ پکی میخیں لگا کر۔‘‘ سادہ میرا وہ کلاس فیلو تھا جس سے ماسٹر جی نے نیکی کا پتہ پوچھا تھا اور اس دن مجھے اس کی قسمت پر رشک آیا تھا۔ یہ معلوم نہ تھا کہ وہ بھی اپنے حصے کے سوال کو زندگی کی زینت بنا لے گا۔ اور جب میں تلاشِ محبت کا زادِ سفر باندھوں گا وہ نیکی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوگا اور پارسائی کی راہ میں ڈرون کا رزق ہو جائے گا۔

ہم بڑے ہوئے تو سادہ مجھے ناپسند کرنے لگا اور اس ناپسندی کی کچھ وجوہات تھیں۔ میری مذہب سے دوری، انگریزی ادب سے لگاؤ، مغربی طرزِ زندگی اور میرے باپ کی جائیداد۔ برعکساً سادہ اپنی غربت کی وجہ سے تعلیم جاری نہ رکھ سکا تو مدرسے جا داخل ہوا جہاں نہ صرف دینی تعلیم دی جاتی بل کہ کھانے پینے کو بھی اچھا مل جاتا۔ کچھ پڑھ لکھ کر وہیں مولوی ہو گیا۔ گاؤں آتا تو گاؤں کی مسجد میں بھی مولوی امان اللہ صاحب کی اجازت سے کبھی نماز پڑھا دیتا، کبھی تقریر کر لیتا، کسی خوش نصیب کا جنازہ پڑھا دیتا۔ بچوں کے ساتھ والی بال اور کرکٹ کھیلتا اور پھر واپس مدرسے لوٹ جاتا۔

’’سادہ بھی دہشت گردی وغیرہ میں تھا؟‘‘ میں نے علی سے پوچھا۔

''کچھ معلوم نہیں، سلیم بھائی۔ یہاں بہت کہانیاں چل رہی ہیں۔ کوئی کہتا ہے تھا، کوئی کہتا ہے نہیں تھا۔ کوئی کہتا ہے اس کے مدرسے میں کوئی تھا جس کی وجہ سے سب مارے گئے، اللہ جانے۔'' علی نے اسی غیر یقینی کیفیت میں کہا جس میں اس وقت تمام پاکستانی تھے۔ مگر میں جانتا تھا کہ سادہ کیوں مرا۔

اور میں کیوں نہیں مرا۔

کیوں کہ سادہ غریب تھا، عام آدمی تھا اور ہماری موجودہ دنیا کے کاروبار میں غریب کے زندہ رہنے سے زیادہ غریب کا مرنا اہم ہو گیا تھا۔ سادہ لکیر کی دوسری اُور رُخ کر کے ٹھہرا تھا۔ اس سادے کو پتہ بھی نہیں چلا اور عصرِ حاضر کا قبلہ بدل گیا۔ نئے ورلڈ آرڈر میں قبلہ رخ نہ ہونے والوں کی سزا موت متعیّن ہوئی تھی۔ سادہ اس اصول سے واقف نہ تھا۔ سو اس سے فرعونِ وقت کی نماز قضا ہو گئی اور جو ایسا کرتے ہیں انھیں ٹھنڈی چھتوں والی قبروں میں اُترنے کا حق نہیں دیا جاتا۔ نئے نظامِ انصاف کی رو سے اس کے چیتھڑے اڑائے جانے تھے، سو اڑائے گئے۔ ماتم کیسا؟ آہ و فغاں کیوں کر؟

میرے اندر پھر یہ احساس مچلا کہ میں غلط جگہ پر ہوں، غلط وقت میں ایک بہت ہی غلط مشن پر۔ دہشت کے موسم میں تلاشِ محبت پر ہونا ایک مجرمانہ مشن تھا۔ میری محبت بے موسم کے پھل کی آس تھی۔ مجھے پاکستان میں ہونا چاہیے تھا اور نہیں تو سادہ کی ماں کے گلے لگ کر رو ہی لیتا۔ یہاں امریکا میں ایسا کندھا نایاب تھا جس پر سر رکھ کر رویا جا سکے۔ خصوصاً اس رُت میں رونا کہ جب امریکی بن لادن کی موت کی خوشیاں منا رہے تھے، بہ قول جینی کے، اس کا سوگ تصور ہوتا کیوں کہ یہاں کے تصورِ تاریخ کے مطابق حالیہ دنوں میں صرف دہشت گرد ہی مارے گئے تھے۔ کچھ چھوٹے، کچھ بڑے جو سارے کے سارے امن پسند دنیا کے لیے خطرہ تھے۔ سو مرنا لازم ٹھہرا تھا۔ ان میں کوئی ایک بھی معصوم نہ تھا، سادہ نہ تھا۔

--☆--

﴿۱۶﴾

میری حالت پھر بگڑنے لگی۔ بل کہ اس قدر بگڑی کہ ہاسٹل کے اصولوں کی پروا نہ کرتے ہوئے جینی تقریباً میرے کمرے میں ہی شفٹ ہو گئی۔ دن میں ہم اپنی اپنی کلاس پڑھنے جاتے اور واپس آتے تو جینی میرے پاس ہی بیٹھ جاتی اور رات گئے تک مجھے اکیلا نہ چھوڑتی۔ کبھی کبھی تو وہ میرے ساتھ والے بیڈ پر ہی لیٹ جاتی اور صبح آنکھ کھلتے ہی اٹھ کر اپنے کمرے کو چلی جاتی۔ اُس کی اس نئی مصروفیت کا سب سے زیادہ اثر ساسا پر ہوا جو وقت پر کھانا نہ ملنے، کمرے میں مناسب درجہ حرارت نہ ہونے یا پھر پورا پورا دن پنجرے نما ساساز ہاؤس میں بند رہنے کی وجہ سے بیمار پڑ گیا۔ اس کی بیماری میں شدت آئی تو ہم نے ایمبولینس بلوائی اور اسے پرندوں کے اُسی ڈاکٹر کے پاس لے گئے جس کے پاس پہلے لے گئے تھے۔ اس نے پہلے تو ہمیں کوسا کہ اس کے لیے ہیلتھ انشورنس کیوں نہ لی اور پھر بے دلی سے ساسا کے گلے میں دو ایک قطرے ایک دوائی کے ڈالے، فیس لی اور ہمیں چلتا کیا۔

اس بار ساسا واقعی بیمار تھا۔

اگلی صبح میں جب یونی ورسٹی کے لیے تیار ہو رہا تھا تو جینی اونچی اونچی آواز میں روتی ہوئی

"کچھ معلوم نہیں، سلیم بھائی۔ یہاں بہت کہانیاں چل رہی ہیں۔ کوئی کہتا ہے تھا، کوئی کہتا ہے نہیں تھا۔ کوئی کہتا ہے اس کے مدرسے میں کوئی تھا جس کی وجہ سے سب مارے گئے، اللہ جانے۔" علی نے اسی غیر یقینی کیفیت میں کہا جس میں اس وقت تمام پاکستانی تھے۔ مگر میں جانتا تھا کہ سادہ کیوں مرا۔

اور میں کیوں نہیں مرا۔

کیوں کہ سادہ غریب تھا، عام آدمی تھا اور ہماری موجودہ دنیا کے کاروبار میں غریب کے زندہ رہنے سے زیادہ غریب کا مرنا اہم ہو گیا تھا۔ سادہ لکیر کی دوسری اَور رُخ کر کے ٹھہرا تھا۔ اس سادے کو پتہ بھی نہیں چلا اور عصرِ حاضر کا قبلہ بدل گیا۔ نئے ورلڈ آرڈر میں قبلہ رخ نہ ہونے والوں کی سزا موت متعیّن ہوئی تھی۔ سادہ اس اصول سے واقف نہ تھا۔ سو اس سے فرعونِ وقت کی نماز قضا ہو گئی اور جو ایسا کرتے ہیں انھیں ٹھنڈی چھتوں والی قبروں میں اُترنے کا حق نہیں دیا جاتا۔ نئے نظامِ انصاف کی رو سے اس کے چیتھڑے اڑائے جانے تھے، سو اڑائے گئے۔ ماتم کیسا؟ آہ و فغاں کیوں کر؟

میرے اندر پھر یہ احساس مچلا کہ میں غلط جگہ پر ہوں، غلط وقت میں ایک بہت ہی غلط مشن پر۔ دہشت کے موسم میں تلاشِ محبت پر ہونا ایک مجرمانہ مشن تھا۔ میری محبت بے موسم کے پھل کی آس تھی۔ مجھے پاکستان میں ہونا چاہیے تھا اور نہیں تو سادہ کی ماں کے گلے لگ کر رو ہی لیتا۔ یہاں امریکا میں ایسا کندھا نایاب تھا جس پر سر رکھ کر رویا جا سکے۔ خصوصاً اس رُت میں رونا کہ جب امریکی بن لادن کی موت کی خوشیاں منا رہے تھے، بہ قول جینی کے، اس کا سوگ تصور ہوتا کیوں کہ یہاں کے تصورِ تاریخ کے مطابق حالیہ دنوں میں صرف دہشت گرد ہی مارے گئے تھے۔ کچھ چھوٹے، کچھ بڑے جو سارے کے سارے امن پسند دنیا کے لیے خطرہ تھے۔ سو مرنا لازم ٹھہرا تھا۔ ان میں کوئی ایک بھی معصوم نہ تھا، سادہ نہ تھا۔

--☆--

﴿۱۶﴾

میری حالت پھر بگڑنے لگی۔ بل کہ اس قدر بگڑی کہ ہاسٹل کے اصولوں کی پروا نہ کرتے ہوئے جینی تقریباً میرے کمرے میں ہی شفٹ ہو گئی۔ دن میں ہم اپنی اپنی کلاس پڑھنے جاتے اور واپس آتے تو جینی میرے پاس ہی بیٹھ جاتی اور رات گئے تک مجھے اکیلا نہ چھوڑتی۔ کبھی کبھی تو وہ میرے ساتھ والے بیڈ پر ہی لیٹ جاتی اور صبح آنکھ کھلتے ہی اٹھ کر اپنے کمرے کو چلی جاتی۔ اُس کی اس نئی مصروفیت کا سب سے زیادہ اثر ساسا پر ہوا جو وقت پر کھانا نہ ملنے، کمرے میں مناسب درجہ حرارت نہ ہونے یا پھر پورا پورا دن پنجرے نما ساسا ساز ہاؤس میں بند رہنے کی وجہ سے بیمار پڑ گیا۔ اس کی بیماری میں شدت آئی تو ہم نے ایمبولینس بلوائی اور اسے پرندوں کے اُسی ڈاکٹر کے پاس لے گئے جس کے پاس پہلے لے گئے تھے۔ اس نے پہلے تو ہمیں کوسا کہ اس کے لیے ہیلتھ انشورنس کیوں نہ لی اور پھر بے دلی سے ساسا کے گلے میں دو ایک قطرے ایک دوائی کے ڈالے، فیس لی اور ہمیں چلتا کیا۔

اس بار ساسا واقعی بیمار تھا۔

اگلی صبح میں جب یونی ورسٹی کے لیے تیار ہو رہا تھا تو جینی اونچی اونچی آواز میں روتی ہوئی

میرے کمرے میں آئی اور میرے گلے لگ کر بتانے لگی کہ ساسا مر گیا ہے۔ ساسا اب اس دنیا میں نہیں رہا ہے، ساسا ہمیں اکیلا چھوڑ گیا ہے۔ میں نے اس کے کندھے تھپتھپا کر تعزیت کی اور ایک طرف بیٹھ کر جرابیں پہننے لگا۔ پھر شوز پہنے اور جینی سے کہا کہ وہ بھی جلدی جلدی تیار ہو کر کلاس پڑھنے چلی جائے تاکہ دھیان بٹ جائے۔ اس پر جینی نے شدتِ حیرت کے ساتھ میری طرف دیکھا اور کہا:

"My Sasa's deadbody is in my room. He is no more. How can you think of classes?"

میں تو اس دن بھی یونی ورسٹی گیا تھا جس دن سادہ مرا تھا۔

مجھے لگا مجھ سے یہ سوال جینی نہیں اٹھارہ کروڑ پاکستانی پوچھ رہے ہیں۔

مجھے متذبذب پا کر جینی خود ہی کہنے لگی کہ: ''ساسا کو دفنانے جانا ہے۔ ہم آج کیسے یونی ورسٹی جا سکتے ہیں۔ ہمیں ساسا کی قبر کھودنی ہے۔ اس کی میموریل سروس کا اہتمام کرنا ہے۔ سوگ منانا ہے۔''

کچھ دیر کے لیے میں نے آنکھیں بند کر لیں اور بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اپنا آپ سمیٹا اور سارا کا سارا بولڈر میں لے آیا۔ خود کو یاد دلایا کہ میں ایک الگ دنیا میں ہوں۔ ایک ایسی دنیا جہاں زندگی کی قدر ہے۔ چاہے وہ کسی شے کی بھی ہو اور اس کی قیمت یونی ورسٹی کی ایک کلاس سے لے کر مشرق کی پوری تہذیب تک کچھ بھی ہو۔ آہستہ آہستہ مجھے اس سانحے کی شدت کا احساس ہوا۔ میں نے پتھرائی آنکھوں سے جینی کو دیکھا۔ جرابیں اتاریں۔ بوجھل قدموں کے ساتھ واش روم میں گیا اور کپڑے بدلے۔ سامنے آئینے پر نظر پڑی تو پتھر آنکھیں نم تھیں۔ میری کیفیت اس لاچار نوکر والی تھی جو سارا دن مالکوں کے کتوں کی مالش کرتا رہتا ہے اور گھر میں اس کے بچے بلک بلک کر نڈھال ہو جاتے ہیں۔ میں باہر آیا اور جینی کو لے کر اس کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ ساسا ابدی نیند سو رہا تھا۔ ساسی افسردہ سی صورت بنائے کھڑی تھی۔ وہ ہر تھوڑی سی دیر کے بعد ساسا کے پروں

میں چونچ مارتی۔ اسے جاگ جانے کی التجا کرتی مگر اس کو بے نیاز پا کر پھر کونے میں کھڑی ہو جاتی۔

جینی پھر رونے لگی۔ میں نے اسے ایک فیس ٹشو دیا اور دلاسا بھی۔ پھر جانے کیا سوچ کر میں نے ساسا کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور جینی کے باتھ روم میں جا کر سنک پر پانی کھولا۔ نیم گرم پانی آنے لگا تو میں نے اسے غسل دیا۔ سفید رنگ کا ٹوائلٹ پیپر نکالا اور اس کے جسم کو خشک کیا۔ پھر اپنے کمرے سے وہ اضافی سفید مفلر جو میں اینا کو دینا چاہتا تھا لا کر ساسا کو اوڑھا دیا۔ جینی نے ساسا کو یوں سفرِ آخرت کے لیے تیار دیکھا تو زور زور سے رونے لگی۔ اس کی آہ و زاری سن کر ہاسٹل کے کچھ اور لوگ بھی وہیں آ گئے۔ ہاسٹل اور بیس بال کے درمیان ایک جگہ کو ساسا کی آخری آرام گاہ کے طور پر منتخب کیا گیا۔ میں نے اک ننھی سی قبر کھودی اور اس میں اپنے ہاتھوں سے ساسا کو اتار دیا۔ اسے لٹا کر قریب پڑی مٹی کی ڈھیری (جسے میڈی گرم کر کے لائی تھی) کی طرف بڑھا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اسے ساسا پر ڈالنے لگا۔

اسی لمحے میں میرے منہ سے ایک نام نکلا۔ ''سادہ!!''

اس نام کی صدا لگاتے ہی میں ہاک مار کر رونے لگا۔ مجھے میرے ملک کے بچے یاد آئے۔ وہاں سے آنے والی خبریں یاد آئیں۔ وہ ننھی ننھی قبریں یاد آئیں جن میں لاشوں کی جگہ ماؤں کے خواب مدفون تھے۔ میں دیر تک روتا رہا اور روتے روتے ساسا کی قبر کے پاس ہی نڈھال ہو کر گر پڑا۔

مجھے وہاں سے میرے کمرے تک کیسے لایا گیا کچھ یاد نہیں ہے مگر جب شام کے وقت میری آنکھ کھلی تو جینی میرے بیڈ کے پاس بیٹھی میری تسبیح کے دانے چلا کر معلوم نہیں اللہ پر کیا ورد کر رہی تھی۔

مجھے ایک بار پھر محبت یاد آئی اور میں مُسکرا دیا۔

جینی بھی نم آنکھوں کے ساتھ مسکرانے لگی۔ مسکراہٹیں علاجِ مرض بھی ہوتی ہیں اور رُو بہ

صحت ہونے کی علامت بھی۔ جینی نے اسرار کیا کہ وہ مجھے ماہر نفسیات کے پاس لے کر جائے گی کیوں کہ میں نے نارمل سے زیادہ سوگ منایا اور ساسا کی موت کو اتنا دل پر لیا کہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ میں اب بالکل ٹھیک ہوں بل کہ بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا ہوں۔ اس لیے فکر کی کوئی بات نہیں۔

سچ بھی یہی تھا۔ آنسو کئی دنوں سے میری آنکھوں میں تیرتے پھر رہے تھے۔ آج میں نے جی بھر کر رو لیا۔ میرے دل پر جو بوجھ بہت عرصے سے جمع ہو رہا تھا، آج ساسا کی وجہ سے ہلکا ہو گیا۔ اسی کی وجہ سے مجھے جینی ملی تھی اور پھر جب غم زدگی کی کیفیت میں میں اس سے دور ہونے لگا تو وہ ایک بار پھر میری تسبیح اس کے ہاتھ تھما گیا۔ میرا غم ہلکا کرا کے مجھے ایک بار پھر جینی کے قریب کر گیا۔

کچھ دیر بعد اینا میرے لیے جوس لے کر آ گئی اور اپنے ہاتھ سے مجھے پلانے لگی۔ جینی سے آنکھ بچا کر میں نے اس کے ہاتھ کو دبایا اور آنکھ ماری۔ چشمِ حیران سے اس نے مجھے گھور کر دیکھا، جیسے کہ رہی ہو کہ تم تو بیماری کے عالم میں بھی فل ہوشیار پڑے ہو۔ پھر جوس مجھے تھما کر دوسرے بیڈ پر جا بیٹھی اور کن اکھیوں سے دیکھ دیکھ کر تا دیر مجھ پہ ٹکٹکی رہی۔

اگلی صبح میڈی میرے لیے ناشتہ بنا کر میرے کمرے میں آئی۔ نِک مجھے پُول کھیلنے کی دعوت دینے آیا۔ تقریباً تمام ہاسٹل والے پھول اور Get well soon کے کارڈ لے کر آئے۔ پورا ہاسٹل میری رحم دلی کا قائل ہو گیا۔ بولڈر شہر میں میرے چرچے ہونے لگے۔ بولڈر ٹائمز نے میری فیس بک کی ڈی پی کے ساتھ شہ سرخی لگائی:

"Pakistani student at CU mourns GF pet's death; unconscious."

--☆--

ایک روز جینی مجھے کولوراڈو سپرنگز لے گئی تا کہ مجھے "Garden of gods" دکھا سکے۔ وہ اس دنیا کا سب سے خوب صورت باغ ہے۔ ہماری دنیا کا آٹھواں عجوبہ۔ اسے دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ اس باغ کو باغ اس لیے نہیں کہا جاتا کہ اس میں پھول، پیڑ یا جھیلیں ہیں بل کہ اس لیے کہ یہاں جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے پہاڑ اُگے ہوئے ہیں جنھیں باغ کے غیبی مالیوں نے ہزاروں سال کی محنت سے یوں تراشا ہے کہ انسان داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کئی قدرتی چٹانیں ایک اینٹ جتنی جگہ پر بھی متوازن کھڑی ہیں۔ غاریں یوں صفائی سے بنی ہوئی ہیں کہ لگتا ہے وسط ایشیا کے کسی معمار نے بہت ناپ ماپ کر بنائی ہیں۔ ان کے اندر کی فضا اتنی تازہ ہے کہ لگتا ہے ہزاروں برس سدھارتھا یہیں کمالہ کی گود میں سر رکھ کے لیٹے رہنے کے بعد ابھی ابھی اٹھ کر گوونداکے پیچھے گیا ہے۔

جینی نے میری بہت ساری تصویریں اتاریں۔ بہت ساری باتیں کیں۔ اس نے مجھے مختصراً اس پارک کی تاریخ بھی بتائی کہ کیسے یہ ہزاروں سیکڑوں ایکٹر پر محیط پورا پارک کسی ایک شخص کی ملکیت تھا جس نے ایک دن کسی دھن میں آ کر اسے حکومت کے حوالے کر دیا اور یوں یہ عجوبہ عوام الناس کے لیے کھول دیا گیا۔ جینی نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ان چٹانوں، ان کے رنگوں اور ان کی شکلوں کے بارے میں کئی قصے معروف ہیں۔ جِن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کئی خداؤں نے مل کر اس باغ کو ان چٹانوں سے سجایا ہے۔ اس پر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے جینی کو بتایا کہ اس کے اور میرے مذہب کے مطابق خدا ایک ہی ہے اور یہ کہ یہ بات عقل کو بھی نہیں لگتی کہ ایک باغ بنانے کے لیے کئی خداؤں کی ضرورت پڑی ہو۔ جینی نے مجھے گھور کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تشکیک تھی۔ مگر وہ خاموش رہی اور کولوراڈو سپرنگز سے بولڈر تک واپسی کے سارے راستے میں بس ہاں، ہوں ہی کرتی رہی۔

--☆--

ایک شام کو میں پرل اسٹریٹ میں اپنے کولمبین دوست ہاوئیر کے ساتھ واک کر رہا تھا کہ ایک شخص نے مجھ سے معذرت کر کے پوچھا کہ کیا میں ہی وہ شخص تھا جو ساسا کی لاش کو قبر میں اتارتے وقت

بے ہوش ہو گیا تھا۔ میرے اثبات میں سر ہلانے پر اس نے پوچھا کہ آیا میں اس کے ساتھ سامنے والے بار میں بیئر پینا پسند کروں گا۔ میرے بتانے پر کہ میں شراب نہیں پیتا، وہ چونکا اور ایک ایسا سوال کر ڈالا جو امریکی عموماً نہیں کرتے:

"Are you a Muslim?"

"Yes."

میرے منہ سے "Yes" ابھی آدھا ہی نکلا ہوگا کہ وہ چل دیا۔ پھر ذرا مڑ کر مجھے ایک بار غور سے دیکھا اور بولا: "!Strange"

--☆--

میرے ہاسٹل والوں نے میرے لیے ایک سوونیئر بنوایا جس پر "The most Kind Hearted Man of the World." لکھوایا اور ایک جمعے کی شب کو پندرہ روزہ پارٹی میں شہر کے بہت سارے لوگوں کی موجودگی میں مجھے پیش کیا اور مجھ سے رحم دلی پر کچھ الفاظ بولنے کو کہا۔ میں وہ سوونیئر ہاتھ میں اٹھائے مائک کے پاس گیا اور آہستہ آہستہ بولنے لگا:

''آپ سب کا بہت شکریہ۔ مجھے اس سوونیئر سے نوازنے کا۔ میری عزت افزائی کا۔ مگر خواتین و حضرات آپ کو یہ جان کر مایوسی ہوگی کہ مَیں دراصل ایک نرم دل انسان نہیں ہوں۔ بل کہ میں شاید اس ہال میں موجود تمام لوگوں میں سب سے زیادہ سخت دل ہوں، میرے سینے میں دل کی بجائے ایک سِل ہے۔

حاضرین، میں پاکستانی ہوں۔۔۔

جب سے ہوش سنبھالا جنگیں دیکھیں، دھماکوں کی دُھول دیکھی، کشت و خون کا بازار گرم دیکھا۔ میرے اردگرد بیسیوں مرتبہ صفِ ماتم بچھی۔ کڑیل جوانوں کے جنازے اٹھتے تو میری بستی کے لوگ غم و غصے سے اپنے بال نوچ ڈالتے، بہنیں آہیں بھرتیں تو سارا عالم رونے لگتا، مائیں ایسے ایسے بین کرتیں کہ عرش تک ہل جاتا مگر مَیں ہمیشہ ایک طمانیت سے آگے بڑھتا رہا۔ خواتین و حضرات، میرے شعور کی تختی سرد جنگوں، سٹنگر اور کروز میزائلوں، کارپٹ بمنگ، خودکش دھماکوں اور ٹارگٹ کلنگ سے عبارت ہے۔ میں اس سب کچھ سے بے نیاز رہا ہوں، ہمیشہ اپنی دھن میں مگن۔ محبت کی کھوج میں محو۔ جی ہاں میں محبت کا کھوجی ہوں۔ ایک ایسا کھوجی جو دہشت کے موسم میں محبت کی فصل لگانے کے خواب دیکھتا ہے۔

میری بستی کے لوگ بجا طور پر مجھے بے حس سمجھتے تھے، میری مثالیت پسندی کی بہ دولت مجھے مجنوں کہتے تھے۔ میں کبھی کسی کی موت پر، قتل پر، ظلم پر، نہ تو رویا ہوں اور نہ ہی احتجاج کیا ہے۔ ساسا کی تدفین والے دن جو کچھ ہوا وہ ویسا نہ تھا جیسا کہ آپ سمجھ رہے ہیں۔ ایک عام سے پرندے کی موت پر ماتم میری روایت کے خلاف ہے، یوں جذباتی ہو کر سر کے بل گر پڑنا میرے قبیلے کی غیرت کے خلاف ہے۔ میرے والد اپنے علاقے کے معروف شکاری ہیں۔ میں نے کئی بار انھیں اڑتے ہوئے، چہچہاتے پرندوں کو مارتے دیکھا، اپنے ہاتھوں سے ذبح کیا، ضیافتیں اڑائیں، ساسا تو پنجرے کا قیدی تھا۔ قیدی کا مرنا میرے نزدیک آزادی پانا ہے۔ آزادی کا جشن منایا جاتا ہے نہ کہ سوگ۔ میرے رونے کی وجہ ساسا کی موت ہرگز نہ تھی۔''

میں سامنے رکھی بوتل میں سے پانی کا ایک گھونٹ لینے کے لیے رکا۔ ہال میں بیٹھے لوگوں میں بے چینی کے باوجود سکوت طاری تھا۔

امریکی سننے کے فن میں اپنی مثال آپ ہیں۔

''اُس روز مجھے ایک تفاوت نے رُلایا۔ ساسا کی موت والے دن میرے سامنے دو دنیاؤں کا بھیانک فرق اس قدر کھل کر سامنے آیا کہ میں اپنے آنسو سنبھال نہیں پایا۔ یہ رونا جذبات کا نہیں ریاضیات کا تھا۔ مجھے تقسیم کی تلوار نے گھائل کیا تھا۔ جس لمحے تیسری دنیا کے ہزاروں بچے بے گور و کفن اپنے اپنے حشرات الارض کے انتظار میں گل رہے تھے اس وقت مَیں آپ کی دنیا کے ایک پرندے کی قبر پر گرم گرم مٹی ڈال رہا تھا تاکہ وہ بعد از مرگ سردی سے محفوظ رہے۔ مجھے معاف کیجیے گا مگر میں ساسا کی موت پر کبھی نہیں رویا اور نہ ہی ان بچوں کی موت پر جن کے جسم بم

کے زیرِ اثر روئی کے ریشوں کی مانند ہوا میں بکھرے تو پھر کبھی نہ جڑ پائے۔ میں تو نصیب پر رویا تھا۔

ہمارا نصیب جو ایک سہ جہتی شے ہے جو پیدائش، وقت اور مقام کی مثلث سے نقش پذیر ہوتا ہے۔ ہر انسان، بل کہ ہر جان دار، ہر شئے کا نصیب یہی ہے کہ وہ کہاں اور کب پیدا ہوتا ہے۔ قدرت کا یہی ایک فیصلہ ہماری پوری زندگی کو کہانی کر دیتا ہے۔ ہمارا پیدا ہونا، ہماری نسل، ہمارے دین، ہمارے رنگ، ہمارے رزق، ہماری زندگی اور یہاں تک کہ ہماری موت و تدفین کی قسم کا بھی تعین کر دیتا ہے۔ یہ معاشرہ، اس دنیا کے تمام معاشرے چاہے کتنے ہی تہذیب یافتہ کیوں نہ ہو جائیں، یہ فرق قائم رکھا جائے گا کیوں کہ فرق ہی اس دنیا کا سب سے قیمتی اثاثہ ہے: خالق کا مخلوق سے، بڑے کا چھوٹے سے، پاک کا ناپاک سے، گورے کا کالے سے، مغرب کا مشرق سے۔۔۔ اگر کچھ اس فرق سے باہر ہے تو وہ ہے محبت۔ محبت جو کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ پیدائش اور اس کے وقت اور مقام کی محتاج ہوئے بغیر۔''

'اف خدایا، یہ محبت مجھے ہمیشہ موضوع سے ہٹا دیتی ہے، بھٹکا دیتی ہے، سب کچھ بھلا دیتی ہے'، میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

''ہاں تو میں یہ کہ رہا تھا کہ نصیبوں کے فرق نے رلایا ہے مجھے۔ مجھے اس چھوٹی سی بات پر رو دینے کے لیے معاف کر دیجیے گا۔ تاہم اگر آپ اجازت دیں تو میں یہ سوونیئر اپنے پاس رکھ لیتا ہوں تا کہ یہ مجھے میرا رونا، اس رونے کا چھوٹا سا سبب اور آپ سب کی محبت یاد دلاتا رہے۔''

مجھے یقین تھا کہ حاضرین کو میری بات پوری طرح سمجھ نہیں آئی، جس فرق کی میں بات کر رہا تھا، اس کی خلیج کی وسعت کا اندازہ یہ خوش گمان لوگ کر ہی نہیں سکتے تھے، پھر بھی سب لوگوں نے پورے جوش و خروش سے تالیاں بجائیں۔ ایک بزرگ خاتون دوڑ کے آئی اور مجھے گلے لگایا۔ جب کہ اس کے بوڑھے خاوند نے لگے ہاتھوں اپنے بڑے سے کیمرے سے ایک تصویر نکال کر دنیاؤں کے بلکتے فرق کو زبان دینے والے اس نایاب لمحے کو محفوظ کر ڈالا۔

امریکہ ایک سمندر کا نام ہے جو پوری دنیا کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ ایسے میں مجھے کیوں کر اجنبیت محسوس ہوگی۔ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر کے میں ایک مرتبہ پھر اپنائیت محسوس کرنے لگا۔ بن لادن کی ہلاکت کے بعد جینی کا بھی پاکستان جانے کا جنون مٹنے لگا تھا۔ میڈی کا کتا بھی شاید میرے فنِ تقریر سے متاثر ہو کر بھونکنے سے باز آ گیا تھا اور وہ خود تو مجھے ساسا کی قبر پر روتے دیکھ کر جیسے میری مرید ہی ہو گئی تھی۔ اب چاہے اس رونے کی وجہ میں اسے کوئی بھی بتاؤں اس کی عقیدت کم ہونے والی نہیں تھی۔

--☆--

محبت واقعی پیدائش اور اس کے وقت اور مقام کی قیود سے ماورا تھی۔ اسلام آباد میں جس کم کرائے والے مکان میں ہم طلبہ رہتے تھے، اس کے مالک خادم صاحب چالیس پینتالیس برس کے ہو گئے تھے مگر ابھی تک کنوارے تھے۔ خادم صاحب خود نیچے والی منزل کے ایک کمرے میں رہتے تھے اور مکان کے مختلف کمروں کو ایک ہاسٹل کی طرح چلاتے تھے۔ بہت صاحب علم آدمی تھے۔ سرمایہ داریت کی تنقید کے علاوہ تصوف، فلسفہ، ادب اور زندگی کی بے ثباتی جیسے موضوعات پر بات کرتے تو سحر طاری کر دیتے۔ اسی لیے میری ان سے خوب گاڑھی چھنتی تھی۔ میں نے بھی یونانی، رومی، اور اسلامی فلسفہ پڑھ رکھا تھا؛ میر و غالب کو یاد کیا تھا؛ تلاوتِ اقبال کو معمول بنا رکھا تھا؛ منٹو اور مشتاق یوسفی کی نثر چاٹتا تھا۔ کبھی کبھی میرے منہ سے بھی کوئی کام کی بات نکل جاتی جسے وہ سب ہاسٹل والوں کو بتاتے پھرتے کہ نالائقو کچھ پڑھا کرو تا کہ تمہیں بھی سلیم کی طرح زندگی کا صحیح ادراک ہو۔

گاہک داریت سے لے کر بین الاقوامی کھیلوں تک کی تنقید سمیت میں ان کی ہر بات سے قائل ہو جاتا تھا۔ سوائے ان کے فلسفۂ ردِ تولید کے۔ وہ شادی کے سخت خلاف تھے۔ ان کے نزدیک لوگ شادی بچے پیدا کرنے کے لیے کرتے ہیں اور اس دور میں بچے پیدا کرنا ظلمِ عظیم ہے۔ ان کے مطابق ہم جب ایک بچہ پیدا کرتے ہیں تو دراصل ہم استعمار کو ایک اور غلام عطا کر

دیتے ہیں۔ سرمایہ داروں کو ایک اور خریدار دیتے ہیں۔ اس عالم میں راج کرتی بیماریوں کو، یہاں کے وائرسوں کو ان کے آسان شکار دیتے ہیں۔ مولویوں کو طالب دیتے ہیں۔ حکمرانوں کو گلا پھاڑ کر نعرے لگانے والے دیتے ہیں، جرنیلوں کو سینہ تان کر لڑنے والے جاں نثار دیتے ہیں۔ یوں ہم دراصل اپنی ہی ذات کے عکس، اپنے جگر گوشے کو اپنے تن کے عرق سے کشید کر کے، پال پوس کے اس دنیا کے بھیڑیوں کے آگے ڈال دیتے ہیں جو کہ ظلم ہے۔ میں اختلاف کرتا کہ نہیں خادم صاحب شادی حُسنِ فطرت ہے۔ تولید کے عمل سے گزر کر ہم دھرتی پر پھول کھلاتے ہیں۔ ہوا کو خُوش بو، فضا کو قہقہے، دنوں کو مسکراہٹیں، شبوں کو خواب دیتے ہیں۔ مکانوں کو مکین دیتے ہیں۔ محبت کی اگلی فصل کو امین دیتے ہیں۔ مگر وہ میری ایک نہ سنتے، اور سر جھٹک جھٹک کر کہتے: ''شادی مت کرنا، بس، شادی مت کرنا۔''

اسی ہاسٹل میں صفائی کے لیے تیس پینتیس برس کی ایک چُوڑھی آنے لگی، جس کا رنگ کالا سیاہ تھا۔ وہ خادم صاحب کا کمرہ صاف کرنے جاتی تو خادم صاحب بھی اٹھتے اور اس کا ہاتھ بٹانے لگتے۔ وہ جھاڑو لگاتی خادم صاحب ڈسٹنگ کرنے لگتے۔ وہ فلش صاف کرتی تو خادم صاحب سِنک دھو لیتے۔ پھر جب وہ دوسرے کمروں کی صفائی کو جاتی تو خادم صاحب واپس اپنی جگہ لوٹ آتے۔ اگر ہم طلبہ میں سے کوئی بیٹھا ہوتا تو اپنی بات کو جاری رکھتے ورنہ اخبار پڑھنے لگ جاتے۔ کچھ عرصہ بعد ہم نے انھیں ایک قدم آگے بڑھتے دیکھا۔ چوڑھی بالائی منزل کے کمروں کی صفائی کر کے واپس آتی تو خادم صاحب کو ڈرائنگ روم میں دو کپ چائے کے سامنے رکھ کر اپنا منتظر پاتی۔ وہ ایک کپ اٹھا کر فرش پر بیٹھ جاتی۔ خادم صاحب بھی نیچے اتر آتے۔ دونوں کوئی مکالمہ نہ کرتے، بس باری باری سُر یلی سُرکیاں لیتے اور یوں آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اپنا آپ دیتے جیسے کوئی صدیوں پرانا قرض چکا رہے ہوں۔ چائے ختم ہوتی تو وہ الوداعی نظروں سے خادم صاحب کو دیکھتی، خادم صاحب اسے۔ وہ اپنا جھاڑو پوچا اٹھا کر چل دیتی اور خادم صاحب واپس اپنے معمول کی طرف پلٹ لیتے۔

شروع میں ہمیں ان کا یہ عمل فلسفۂ زندگی کی کوئی وقتی تشریح لگا مگر کچھ عرصہ بعد جب ایک دن علی الصبح وہ چوڑھی میرے کمرے میں صفائی کر رہی تھی تو میں نے گرد و غبار کو راستہ دینے کے لیے کھڑکیوں پر سے پردے ہٹائے اور انھیں کھولنے لگا تو سامنے خادم صاحب نظر آئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک لمبا سا جھاڑو تھا اور وہ ٹیرس کو صاف کرنے میں یوں خشوع و خضوع سے مصروف تھے جیسے ان کی ساری پشتیں یہی کام کرتی آئی ہوں۔ یہ بات بھی ہضم ہونے والی سی تھی۔ مجھے جھٹکا اس وقت لگا جب چوڑھی میرے باتھ روم میں گئی اور اپنی بھدی سی آواز میں پکار کر کہا ''آ جائیں۔'' اس سے پہلے کہ میں اسے اپنے لیے دعوتِ گناہ سمجھ کر چوڑھی پر پل پڑتا، خادم صاحب بغیر اجازت میرے کمرے میں داخل ہوئے اور کسی منجھے ہوئے چُوڑھے کی طرح بغیر کوئی سلام دعا کیے سیدھے باتھ روم میں گھس گئے۔ تجسس کا جی للچایا تو میں نے چپل پہننے کے بہانے سے اندر گھس کر دیکھا وہ فلش دھو رہی تھی اور یہ سنک کو رگڑ رہے تھے۔

اب چائے بنانا ہاسٹل کے باورچی کے ذمے ہو گیا تھا۔ چوڑھی اور خادم صاحب سب کمروں کی صفائی کر کے نیچے جاتے تو چائے تیار ہوتی۔ اُسے پوری گلی میں جھاڑو پھیرنے اور تمام گھروں کا کوڑا اٹھانے کی جلدی ہوتی تھی۔ سو خادم صاحب بار بار اس کی چائے کو ایک پیالی سے دوسری اور دوسری سے واپس پہلی میں ڈالِ ڈال کر ٹھنڈا کرتے اور اسے دیتے۔ ان کی یہ دلبر نوازی اس قدر پریکٹیکل تھی کہ کاروبارِ دنیا بھی متاثر نہ ہوتا اور ستائشِ یار بھی ہو جاتی۔ تاہم دلبر اور دل دار کے بیچ حائل حقائق تھے کہ ہم تمام ہاسٹل والوں کو مبتلائے حیرت کیے جاتے تھے۔ چاہنے والا باعلم، چاہے جانے والی تقریباً اَن پڑھ؛ من موہن ثروت مند، من موہنی کوڑی کوڑی کی محتاج؛ بھنورہ شعلہ صفت، شمع کوئلے سے بھی زیادہ کالی؛ خادم صاحب مسلمان، چوڑھی عیسائی۔ عقل تو گُجا، یہ تعلق دل کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ خادم صاحب کے فیصلے ہمیشہ اس قدر درست اور مدلل ہوا کرتے تھے کہ ہمیں ان پر سوال اٹھانے کی جرات ہی نہ ہوتی۔ اب بھی کسی نے براہ راست تو ان سے نہ پوچھا کہ آپ یہ چوڑھی کے ساتھ گھر کی صفائیاں کیوں کرتے ہیں مگر لڑکوں نے ان کی عدم موجودگی میں

ٹھٹھامذاق ضرور شروع کردیا۔ کچھ لڑکوں نے مجھے بھی مذاقاً تاکید کی کہ فلسفہ پڑھنے سے باز آجاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بھی چوڑھوں کو چائے ٹھنڈی کر کر کے پلانے پر اتر آؤ۔

نمل میں گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں تو تمام لڑکے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ میں طویل دورانیے کی تعطیلات اسلام آباد میں گزارتا تھا اور معمول کے مطابق ہر ہفتے ہی گھر جاتا مگر تعطیلات کے آغاز میں امی جی اور ابو جی کے اصرار پر ایک ہفتہ دس دن کے دورانیے کے لیے بھی گاؤں چلا جاتا۔ حسب معمول اب کی بار بھی میں نے کچھ سامان لیا اور گاؤں چلا گیا۔ تقریباً دس دن بعد جب میں صبح صادق کے وقت واپس آیا تو ہاسٹل والے مکان کو تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے خادم صاحب کو موبائل پر کال ملائی ہی تھی کہ ہمسائیوں کا ایک بچہ مکان کے باہر والے دروازے کی چابی لے کر آیا اور مجھے تھما کر اسی سپیڈ اور جانگیے کے ساتھ واپس دوڑ گیا جس میں آیا تھا۔ میں نے تالا کھولا اور سیدھا فرسٹ فلور پر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ رات بھر کے سفر سے بدن ٹوٹ رہا تھا۔ میں نے بیگ ایک کونے میں پھینکا اور سو گیا۔

--☆--

رمضان کا مہینہ تھا۔ میں روزہ رکھ کے بیٹھا تھا۔ شدید بھوک لگی تھی۔ اچانک محلے کی مسجد کا سائرن بجنے لگا اور میں خوشی سے نہال ہو گیا۔ میں افطاری کی نیت کرنے لگا تو زور زور سے گھنٹیاں بجنے لگیں۔ یہ ایک مندر کی گھنٹیاں تھیں۔ میرے پہلو میں کھڑا ایک شخص گھنٹیاں بجاتا ہوا آگے آیا اور میرے ماتھے پر کچھ لگانے لگا۔ اس نے صلیب کا نشان دیا۔ گرجا گھر کی گھنٹیاں اب بھی بج رہی تھیں۔

--☆--

اچانک میری آنکھ کھلی تو ڈور بیل کے مسلسل بجنے کا احساس ہوا۔ میں جلدی سے اٹھا اور گرتا پڑتا نیچے گیا۔ دروازہ کھولا تو چوڑھی ہاتھ میں جھاڑو پکڑے اندر آنے کی منتظر تھی۔ میں نے اسے سلام کیا اور جب وہ اندر آ چکی تو دروازہ پھیر دیا۔ آنکھیں ملتے ہوئے میں نے ابھی ایک ہی قدم

اٹھایا ہوگا کہ میرے دماغ میں ایک چھناکا سا ہوا۔ ''وہ کون تھا۔۔۔ گلی میں۔۔۔'' چوڑھی نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا تو میں نے اپنے سوال کے الفاظ بدل کر کہا: ''وہ داڑھی والا کالا سا بندہ کون ہے؟ جو جھاڑو دے رہا ہے، گلی میں؟''

''خادم صاحب'' اس نے ہمیشہ کی طرح سنجیدگی سے کہا۔ پھر اپنے ازار بند سے بندھی چابی نکالی اور ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر اندر گھس گئی۔ میں دوڑ کر گلی میں آیا۔ کوڑے کی ایک چھوٹی سی ڈھیری پر خادم صاحب یوں جھکے تھے جیسے ان کے لیے کل کائنات یہی ہو۔ اس کائنات کے سبھی سوالوں کا جواب یہی ڈھیری ہو۔ اسے پا کر عرفانِ ذات کی سبھی منزلیں طے کی جا سکتی ہوں۔ وہ اس قدر منہمک تھے کہ میں نے ان کے کندھے پر زور سے ہاتھ مارا تو بھی نہ چونکے۔ جیسے چونکنا اب اُن پہ حرام ہو۔ ان کا جھاڑو اب بھی ڈھیری کے پاس پڑے ایک تنکے کو سمیٹنے میں لگا تھا۔ وہ اسے آہستہ آہستہ ڈھیری کے قریب لا رہے تھے۔ اس وقت ان کی تمام توجہ ذرے کو صحرا سے ملتے ہوئے دیکھنے پر مرکوز تھی۔ قطرے کو قلزم میں گرتے ہوئے، دریا کو سمندر میں اترتے ہوئے، جز کو کل میں فنا ہوتے ہوئے دیکھا کیے۔

''یہ کیا تماشا ہے، خادم صاحب؟'' میرا سوال وحدت الوجود سے متعلق نہ تھا بل کہ ان کے نئے پیشے اور خستہ حالت سے متعلق تھا۔ جسے وہ فوراً سمجھ گئے۔ جھاڑو کو دیوار سے لٹکا کر پیلی ہوتی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھ کر کہنے لگے: ''یہ سوال مجھ سے اس گلی کے سب مکینوں نے پوچھا ہے اور میں نے ان کی ذہنی استعداد کے مطابق سب کو جواب دیے ہیں۔ مگر میں تمھیں اس کا کوئی جواب نہیں دوں گا۔ نہیں دوں گا۔ خود ڈھونڈو تم۔ تم ڈھونڈو خود۔''

وہ پھر سے اپنی ڈھیری پر جھک گئے اور میں محبت سے جُڑے ایک اور سوال کو اپنے کاندھے پر لاد کر ہاسٹل کی طرف پلٹ آیا۔ خادم صاحب نہ صرف یہ کہ چوڑھی سے محبت کے مجرم تھے بل کہ اپنے ہی فلسفے کے خلاف اس کے رفیقِ حیات بھی بن چکے تھے اور معلوم نہیں کیوں اسے اپنے گھر میں لانے کے بہ جائے اس کے جُھگی نما گھر میں منتقل ہو گئے تھے۔

میں واپس اپنے کمرے میں آیا تو چوڑھی میرے کمرے کا واش روم صاف کر رہی تھی۔ میرے جی میں آیا کہ اس ساحرہ کو گالیاں دوں، دھکے دے کر یہاں سے نکال دوں کہ اس نے ایک ہیرے جیسے شخص پہ سحر کر کے اسے گلی کا کیڑا بنا دیا۔ مگر پھر سوچا کیوں نہ پہلے کچھ جانچ پرکھ کر لوں۔

''تم محبت کرتی ہو، خادم صاحب سے؟'' میں نے واش روم کے دروازے سے جھانکتے ہوئے کہا۔

''ایسے ہیرے سے آغاز ہی عشق سے کرتے ہیں۔'' اس نے فلش کو رگڑتے ہوئے کہا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''خادمہ۔''

یہ نام سنتے ہی مجھے اس دنیا کے کئی بگ دار نام فلش میں گرتے پانی میں بہتے ہوئے دکھائی دیے۔

--☆--

﴿17﴾

میں اور جینی ایک ویک اینڈ پر شام کے وقت اپنی اپنی سائیکلوں پر بیٹھے اور بولڈر کریک سے ہوتے ہوئے ڈریم ویلی یعنی وادیِ خواب کو جا نکلے۔ دونوں طرف سفید پوش برفیلے پہاڑ تھے۔ سڑک کے ساتھ ساتھ ایک خوب صورت ندی جا رہی تھی۔ کہیں سے پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جینی آگے آگے جا رہی تھی، میں پیچھے پیچھے۔ کہیں کہیں سڑک کے کنارے پہاڑی کے دامن میں بہتی ندی کے پار کوئی چھوٹا سا گھر نظر آ جاتا تو جینی پیچھے مڑ کر دیکھتی اور مجھ سے پوچھتی: "Wanna live here?" اور میں ہاں میں سر ہلا دیتا۔ ایک گھر ندی کے اوپر یوں بنا ہوا تھا کہ ندی اس کے نیچے سے گزرتے ہوئے اس گھر کا سوئمنگ پول لگ رہی تھی۔ جینی وہیں رکی اور اونچی آواز میں مجھ سے کہا: "I need this house, Saleem."

''میں تمہارے لیے ایسا ہی ایک چھوٹا سا خوبصورت گھر بناؤں گا، جینی۔'' میں نے اس قدر اونچی آواز میں کہا کہ ایک لمحے کو پرندے اپنے نغمے برخاست کر کے ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔

"And you know what, Saleem? I am loving this shade of grey all around."

جینی زمان و مکان کے اس سنگم پر پھیلے سلیٹی رنگ کے سحر میں مبہوت کھڑی تھی۔ شام کا پہر تھا، سورج چوٹی کے پار اتر کر ہمارا منتظر تھا۔ لیکن یہاں آسمان پر تیرتے بادلوں سے لے کر اس مکان کے اندر سے بہتی ندی تک اور سڑک کے اطراف پڑی برف سے لے کر درختوں کے پتوں تک سب کچھ سلیٹی میں رنگا ہوا تھا۔ اور اس وقت یہ رنگ جینی کے دمکتے بدن پر اتر رہا تھا۔ میں جو اسے ہمیشہ روشن رکھنا چاہتا تھا، سلیٹی رنگ میں ماند پڑتے کیسے دیکھتا؟

"Let's go, Jenny."

میں نے اس کی کمر کو تھپکا اور وہ کچھ بولے بغیر سائیکل کو اُس اور کھینچنے لگی جدھر روشنی تھی۔ پہاڑی کے دوسری طرف۔

آگے چڑھائی تھی۔ سائیکل چلانا دشوار ہو رہا تھا۔ ہماری سانسیں پھول رہی تھیں۔ سڑک پہاڑی کی چوٹی کے پاس پہنچ کر زیادہ ڈھلوان ہو گئی تھی۔ ذرا آگے جا کر ہم سائیکلوں سے اتر گئے۔ جینی مجھ سے آگے تھی، سائیکل کو سڑک پر پھینک کر وہ میرے پاس آ گئی۔ پھر مجھے پیچھے پھرنے کو کہا اور میری آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ الٹے قدم چلنے لگی۔ جب ہم ایک خاص مقام پر پہنچ گئے تو اس نے مجھے پہلے ایک سو اسی کے زاویے پر گھمایا، میرا رخ اس طرف کو کیا جو ابھی میری آنکھوں نے نہیں دیکھا تھا۔ جہاں جینی کا کوئی راز چھپا تھا۔ محبت کی کوئی تمثیل پنہاں تھی۔

پھر اس نے آہستہ سے میرے دائیں کان میں "I love you" کہا۔ اور میری آنکھوں سے ہاتھ ہٹا لیے۔

سامنے حیرت کا وہ سامان تھا جو میں نے اس زندگی میں دیکھنے کا کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ اک وادی تھی۔ رنگ اور نور سے سجی دھنک وادی۔ کسی نے صحیح نام دیا تھا اسے 'وادیِ خواب'۔ ایک طرف بہت بڑی جھیل تھی جس کے لہلہاتے مرید اپنی کوکھ کی رنگا رنگ پتیوں سے اس کے قدم ڈھانپ رہے تھے۔ سرو قامت پیڑ اس گل کدے میں یوں ایستادہ تھے جیسے گلوں کی نگہبانی پر معمور ہوں۔ غروبِ آفتاب کی کرنیں پھولوں کلیوں سے چھن کر جھیل کے پانیوں میں نہا کر منعکس ہوتیں

تو وادی کے طول و عرض میں رنگوں کا ایک ایسا امتزاج بن کر بکھرتیں جو ہماری دنیا میں ناپید ہے۔ ہلکی ہلکی ہوا میں خوش بو کی آمیزش اتنی متناسب تھی کہ یہ طے کرنا محال ہو رہا تھا کہ میرا دل اور روح ابھی تک میرے جسم میں ہیں یا اس ہوا میں تحلیل ہو کر وادیِ خواب کی جھولی میں۔

ہم ابھی کرۂ زمیں کی اس نگارش سے ہی لطف اندوز ہو رہے تھے کہ وادی کے آسمان نے اپنے ہونے کا ثبوت دیا۔ ہلکی ہلکی پھُوار اترنے لگی۔ ہم اس میں بھیگنے لگے۔ بارش مجھے ہمیشہ ہی بھلی لگتی تھی۔ مگر اس وادی کی یہ میگھا جو ننھی ننھی بوندیں برس رہی تھی ان کی ترکیب ہی کچھ اور تھی۔ ہر بوند شہد کی شیرینی، گلاب کی مہک، اور صبا کی خنکی کا اک فردوسی مرکب تھی۔ یہ آبی ذرے ہونٹوں پہ پھسلتے تو شربتی ذائقے لے کر، سانسوں میں اترتے تو گلوں کی مہکار لے کر، دہکتے سینے پر پڑتے تو خشخاش کی تاثیر لے کر۔ جوں جوں یہ بوندیں وادی کو فرشی سلام کرتی گئیں اس کے خاکی ذروں کو بوسا دیتی گئیں اک چمتکار ہوتا گیا۔ ذرے کھلتے گئے، مٹی سے سوندھی سوندھی خوشبو پھوٹتی گئی۔ اب رنگ، نور اور کھلتی ہوئی بُو کا ماخذ کبھی برکھا لگتی، کبھی مٹی، کبھی کرنیں، کبھی وادی اور کبھی جینی جو اس وقت مجھ سے یوں مَس تھی جیسے خاک کے ذروں سے بوندیں۔

کچھ دیر ہی میں آسمان پر ایک قوسِ قزح بادلوں کا گلوبند بن کر ابھر آئی۔ رُخِ تراب سے لے کر فلک کے فانوس تک ایک کینوس تھا جس پر قدرت محبت کے سب رنگوں، سبھی ہواؤں، سبھی خوش بوؤں اور تمام مرغولوں سے ایک تصویر بنا رہی تھی۔ یہ منظر مقامی بھی تھا اور مناجاتی بھی، حقیقی بھی، طلسماتی بھی، میری عقل دنگ تھی اور دل شانت!

منظر کو سمیٹنے کی خاطر میں نے ایک لمحے کو جینی کو چھوڑا، اک قدم آگے بڑھا، آنکھیں بند کیں اور اپنے بازو ہوا میں پھیلا لیے۔ قدرت نے جب ان میں دنیا بھر کا پیار بھر دیا تو آہستہ آہستہ میں اپنے بازوؤں کو سمیٹنے لگا۔ حتیٰ کہ پوری وادی مجھ میں اتر آئی۔ میں معطر بھی تھا اور منور بھی۔

میں نے آنکھیں کھولیں تو میری بانہوں میں جینی تھی۔

"Are we not in heaven, Jenny?"

جینی نے ہنستے ہوئے اونچی آواز میں کہا۔ میں بھی بے وجہ ہنس دیا۔

"Nooo...."

"You are a Muslim, and I a Christian; We can't be in heaven together."

جینی کی اس بات پر پہلے تو میں ہنسا مگر پھر اک عجیب سی فکر میں پڑ گیا۔

شاید اسی احساس کے بوجھ تلے واپسی پر مجھ سے سائیکل نہیں چلائی جا رہی تھی۔ حالاں کہ اب زیادہ تر راستہ اترائی تھی، پھر بھی میں خود کو تھکا ہوا سا محسوس کر رہا تھا۔ سائیکل کی گدی پر کبڑا ہوا سا بیٹھا تھا۔ ہم ندی کے شوریدہ پانی پر بنے جینی کے پسندیدہ چھوٹے سے گھر کے پاس سے گزرے تو وہاں شام، رات سے معاملہ بندی میں مگن تھی۔ شاہراہِ وقت سے شام اپنا سلیٹی لبادہ لپیٹ رہی تھی جب کہ رات اسی شاہراہِ وقت پر اپنا سُرمئی رنگ پھیلا کر سونے آئی تھی۔

"Saleem!"

جینی کو رکتے دیکھا تو میں نے بھی بریک لگالی اور اس کی بات کا انتظار کرنے لگا۔

"I love this shade of grey even more!!"

میں خاموشی سے مسکرا دیا۔

"Do you like this color?" اس نے پوچھا۔

"No, Jenny. It symbolises departure, mourning; makes me sad."

وہ خاموشی سے اپنی سائیکل پر بیٹھی، اور اس کی سائیکل ڈھلوان سڑک پر خود بخود تیرتی ہوئی نیچے جانے لگی۔

--☆--

اب میرے لیے فکرمندی کا باعث یہ امر تھا کہ یہ محبت جسے میں نے کئی زمانے صَرف کر کے تلاشا تھا، ہیشگی سے عاری تھی۔ میں مسلسل فکر کرتا رہا۔ مگر الجھن سلجھنے کے بجائے الجھتی ہی چلی گئی۔

اگلے روز سہ پہر کے وقت میں بیس بال کے گراؤنڈ میں جا بیٹھا اور بانسری بجانے لگا، تا دیر بجاتا رہا۔ راگ کے سب رانجھوں کو، محبت کے مجنوؤں کو، پیار کے پنوؤں کو، مٹھڑی تال کے ماہی والوں کو پکارتا رہا کہ آؤ اور میری محبت میں بھی زندگی بھر دو۔ کیسے بھی کر دو میرے پیار کو پائیدار کر دو۔

میری صدا کی شنوائی ہوئی۔ رانجھا، پنوں، ماہی وال باری باری سب آئے اور پریت کو امر کرنے کے نسخے بتانے لگے۔ رانجھے نے کہا سیال بن جاؤ۔ پنوں نے کہا ہندو ہو جاؤ۔ ماہی وال نے کہا کمہار بن جاؤ۔۔۔ میں نے سب کا شکریہ ادا کیا، بانسری کو اس کے کیس میں رکھا، گراؤنڈ سے اٹھا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ دل میں اب سکون سا تھا۔ مجھے میرے مسئلے کا حل مل چکا تھا۔ میری الجھن سلجھ گئی تھی۔

کچھ وقت بعد جینی مسکراتی ہوئی میرے کمرے میں آئی۔ دراصل وہ مجھ سے تحسین لینے آئی تھی۔ اس نے وہ شال اوڑھی ہوئی تھی جو کچھ عرصہ قبل میں نے پاکستان سے منگوا کر اسے دی تھی۔ سر کو ڈھکے وہ میرے گاؤں کی کوئی بہت ہی باحیا خاتون لگ رہی تھی۔ کوئی پانچ وقت کی نمازن۔ میں نے اسے اپنے پاس بلایا، اس کے ماتھے پہ بوسہ دیا، پیار سے پاس بٹھایا۔ پھر اسے یہ بتایا کہ وہ اس وقت اس کائنات کی سب سے مکمل عورت لگ رہی ہے۔ جینی مسکراتی رہی، شرماتی رہی۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر میں نے اسے سرگوشی کے انداز میں کہا:

"Jenny, I invite you to Islam. Please become a Muslim so our love...."

ردِعمل کے طور پہ اس کی آنکھوں میں پہلے حیرت اتری اور پھر خوف، پھر غصہ اور آخر میں۔۔۔ خدا کرے کہ یہ غلط ہو۔۔۔ میں نے ان آنکھوں میں اپنے لیے نفرت دیکھی۔ وہ دھیرے سے پیچھے

ہٹی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ میں وہیں بیٹھا ہارے ہوئے مباحثہ باز کی طرح اپنے جملے اور اس کے ردِعمل کا تجزیہ کرتا رہا۔

محبت قربانی دینے کا نام ہے لینے کا نہیں۔ محبت نام ہی فنا ہونے کا ہے۔ آزمانے کا نہیں۔ شاید اس کے شال اوڑھنے کا عمل تھا کہ جس کی وجہ سے میں نے رانجھے، پنوں، اور ماہی وال کی نصیحت نہیں مانی تھی۔ چوڑھپ قبول کرنے والے خادم صاحب سے سیکھا ہوا سبق بھلا بیٹھا تھا یا شاید میں محبت کو مذہب پر ترجیح دینے کو تیار نہ تھا اور محبت بھی ابدی چاہتا تھا۔ تو کیا ابدی محبت سلیکٹو ہوتی ہے۔ کیا اس میں منہا کا اصول لاگو ہو جاتا ہے؟ کیا داستانوں کی دنیا کے شہزادے مجھے غلط مت لگا رہے تھے؟ یا میں کسی ایسے زمانے میں پیدا ہوا تھا جہاں محبت کا اسکوپ آفاقیت سے سمٹ کر انتخابیت تک محدود ہو گیا تھا؟

--☆--

اس روز شام کا کھانا کھانے میں تاج ریستوران پر گیا۔ مگر وہ پاکستانی لڑکی وہاں نظر نہ آئی۔ میں نے وہاں ایک ویٹر سے گپ شپ کی۔ پہلی بار اسکول والے انڈیا کو بھلا کر کسی بھارتی سے صدقِ دل سے دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور واپس آتے ہوئے اسے گلے بھی لگایا۔ مگر جس کی وجہ سے یہ سب کچھ کیا اس کا پوچھنا ہی بھول گیا اور منہ اٹھا کے واپس آ گیا۔

میں راستے میں ایک سگنل پر تھا کہ جینی کا میسج آ گیا: "Where?"

پہلے مجھے لگا کہ جینی کہیں ارد گرد موجود ہے۔ مجھے تاج پر دیکھ چکی ہے۔ پھر چور کی داڑھی کا ضرب المثلی تنکا جھٹکا اور لکھا: "Just outside the The Skies"

جواباً اس نے لکھا: "Wanna see ya."

میں پہلے ہی ہاسٹل کے قریب پہنچ چکا تھا لہٰذا میسج کا جواب دینے کے بہ جائے میں نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔ ہاسٹل پہنچ کر گاڑی پارک کی اور دوڑتا ہوا جینی کے کمرے کی طرف گیا۔

وہ میری منتظر تھی۔ بل کہ سراپا سوال تھی۔ سوال، جو اس کے لبوں پر شعلہ بن کر لپک آیا:

"Why do you want me to convert?"

سوال اور جواب کے بیچ میں جتنا وقت ہوتا ہے، اس میں مَیں نے اس سوال کا مطلب سمجھنے کی پوری کوشش کی اور پھر جینی کی سادگی کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے ایک عام سوال سمجھا اور معصومیت سے کہا:

"So we can together go to Paradise, Jenny."

"So you want to make me a suicide bomber?"

جینی نے پہلی بار مجھ پر چِلا کے کہا۔

اس کی آنکھوں میں خوف بھی تھا اور غضب ناکی بھی۔ اس کے بعد کم گو جینی نے لفظوں کے وہ وار کیے کہ مجھے سنبھلنے نہ دیا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ مجھے حوروں کی فکر ہے۔ اس نے پوچھا کہ مجھے ہر وقت اس زندگی سے زیادہ اگلی زندگی کی فکر کیوں رہتی ہے؟ اور یہ کہ میں کون ہوں اور میرا مقصدِ حیات کیا ہے؟ اور میں جینی کو جنت لے جانے کا شوقین کیوں ہوں اور یہ کہ اسے معلوم ہے کہ میں امریکی پالیسیوں کے خلاف ہوں اور یہ کہ اسے اس دن ہی میری اصلیت معلوم ہو جانی چاہیے تھی جس دن میں نے سب کے سامنے دھڑلے سے کہا تھا کہ میں ساسا کے مرنے پر نہیں بل کہ دنیا کی غیر مساوی تقسیم پر رویا تھا۔ حالاں کہ یہ تقسیم اس لیے ہے کہ پاکستان جیسے ملکوں کے لیڈر کرپٹ ہیں اور عوام نکمے۔

''مگر میں نے تم سے محبت کی تھی، سلیم۔'' محبت کا ذکر کر کے وہ رو دی۔ تیز تیز سانس لے کے وہ اُس بچے کی طرف ڈُسکیاں بھرنے لگی جسے پرائے لوگوں کے بیچ کھُل کر رونا برا لگتا ہے۔

سیاق و سباق کوئی اور ہوتا تو میں آگے بڑھتا اور اسے اپنی بانہوں میں بھر لیتا۔ مگر آج میں جہاں کھڑا تھا، وہیں ٹھہرا رہا۔ البتہ کچھ دیر بعد میں نے اس سے شکوہ ضرور کیا: ''جینی تم پاکستان کا مطالعہ کرتے کرتے غلط مواد پڑھنے لگی ہو۔ جنت میں جانے کا مطلب اس زندگی کے بعد نہ کہ جیسے خودکش بمبار سوچتے ہیں۔'' میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ اس کا یہ ردِعمل میری سمجھ سے بالاتر

ہے۔ مذہب کی دعوت اس دنیا کا معمول ہے۔ اسے نہیں پسند منع کر دے مگر مجھ پر شک کرنا، اس سے بے وزن نتائج اخذ کرنا، میرے عزائم کی فکر میں پڑنا اور مجھ پر یوں چلانا بہت ہی غلط ہے۔

میرا انداز معذرت خواہانہ بھی تھا اور پر شکوہ بھی۔ بہت ساری باتیں کر کے جب مجھے لگا کہ جینی کا غصہ ٹھنڈا پڑ چکا ہے، میں آگے بڑھا اور اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا:

"I am sorry. You are perfect as you are. You don't need to convert. But please don't judge me."

--☆--

اگلے روز سے ایک بار پھر ہم یک جان دو قالب تھے۔ باسکٹ بال کھیلتے ہوئے ایک دوسرے کو رعایتیں دیتے، پول پر بال کو اسٹرائیک کرنے سے پہلے ایک دوسرے کو آنکھ مارتے، بائیکنگ کرتے ہوئے ایک دوسرے کو یاد دلاتے کہ ہم ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں اور کسی گلی میں واک کرتے ہوئے کوئی خوب صورت لڑکی نظر آتی تو میں جینی کی کمر پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنے پاس کر لیتا اور اگر کوئی وجیہہ نوجوان دکھائی دیتا تو جینی میری کہنی میں بازو ڈال کر اپنا سر میرے کندھے پر رکھ لیتی۔ کبھی کبھی میں اس کے لیے بانسری بجاتا تو وہ بدلے میں مجھے میرا پسندیدہ گانا "I feel you" سناتی۔

مگر ہمیں یہ سب کرنے کی پہلے کبھی اتنی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ دراصل ہم جان گئے تھے کہ ہماری دوستی میں بال آ چکا ہے۔

--☆--

ایک عام سا دن تھا۔ میں یونی ورسٹی سے واپس آیا اور ڈائننگ ہال میں فریج میں سے اپنا کھانا نکال کر کھانے لگا۔ میرے سلاد میں ایک سرخ رنگ کی میٹھی مرچ تھی جو شاید سبز مرچ اور ٹماٹر یا سیب کے کراس سے بنائی گئی تھی۔ سامنے میز پر رکھے کین میں پانی کی جگہ کولڈ فرنچ ونیلا چائے پڑی تھی۔ ایک ایک چک، ایک ایک سُرکی میں تین تین ذائقے صرف ترقی یافتہ دنیا میں ممکن

تھے۔ ان دو عجیب و غریب چیزوں کے علاوہ میرے کھانے میں ایک ٹکڑا تربوز کا بھی شامل تھا۔ بولڈر میں برف باری کے مہینے اپریل میں تازہ تربوز کا دست یاب ہونا کسی جادو سے کم نہ تھا۔ یہ سوچتے ہوئے کہ امریکہ کے پاس خدا کی تمام نعمتیں ہیں جو سال کے بارہ مہینے یہاں کے لوگوں کے رزق کا حصہ رہتی ہیں، میرے چہرے پر ایک نقاد والی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ مسکراہٹ جو نفی اثبات کا مرکب تھی۔ امریکیوں کی ہر نعمت تک رسائی پر۔

اچانک کچن میں سے میڈی نکلی اور فرشتۂ اجل بن کر میرے سر پر آ کھڑی ہوئی۔

''یو لفنگ؟ یو ہیپی دیٹ یور کنٹری گائے پلانٹڈ بم ان بوسٹن میراتھن؟''

''دھاڑ دئے۔۔۔''

اپنے ملک اور بم کا اکٹھا ذکر میں نے کوئی پہلی بار نہیں سنا تھا، مگر بوسٹن کے میراتھن میں بم کا ہونا بہت مہلک تھا۔ میرے ملک کے لاکھوں لوگ آج بھی ایک خاموش دعا کرتے ہیں کہ: خدایا یہاں جتنے دھماکے ہونے ہیں ہو جائیں، امریکا کے تمام ٹاوروں کو، چوکوں کو، سینما گھروں کو، اور گلیوں کو اپنی حفظ و امان میں رکھنا۔ کیوں کہ انھیں معلوم ہے کہ امریکا میں دھماکے کا ذمہ دار چاہے کوئی بھی ہو خراج ہماری دنیا کو ادا کرنا پڑتا ہے۔

میڈی نے مجھے بتایا کہ دو ہلاک ہو گئے ہیں اور کئی زخمی ہیں۔ جب کہ باقی کے سبھی لوگ ٹراما میں ہیں۔ میرے جی میں آیا میڈی سے کہوں:

You are the mother of all bad news!

مگر یہ وقت اسے طعنے دینے کا نہیں تھا سو میں معصوم جانوں کے زیاں پر اور عام لوگوں کے خوف و ہراس میں مبتلا ہونے پر میڈی سے افسوس کرنے لگا۔ اتنے میں جینی بھی اپنی کلاس سے واپس آ گئی۔ میڈی نے میرے ہنسنے کے ذکر سے لے کر بوسٹن میں ہونے والے دھماکے اور بوسٹن والوں کے ٹراما تک سب دوبارہ بتا دیا۔ جینی نے مجھ سے کوئی بات نہ کی......!!

جلدی جلدی ٹراوزر کی جیب سے موبائل نکالا اور نمبر ملانے لگی۔ میرا تجسس میڈی سے

زیادہ تھا۔لہٰذا میں ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا، جب کہ میڈی نے اس کے کندھے سے بیگ اتارا اور سامنے پڑی میز پر رکھا،اس کے بال ٹھیک کیے اور بیچ بیچ میں مجھے گھورتی گئی۔

"Hello... Dave... How're ya, darling?"

اس نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔ڈیو، جینی کا وہ بوائے فرینڈ تھا جو اسے روتا چھوڑ کر ایل۔اے۔ چلا گیا تھا۔

"I am so sorry to hear that... Okay. Okay. Don't worry, honey. I am on my way. I am on my way to Boston. See ya by evening."

جینی نے فون بند کیا۔میڈی کو بتایا کہ ڈیو بھی اس وقت میراتھن میں تھا جب یہ دھماکہ ہوا سو وہ بہت خوف زدہ ہے۔اس لیے جینی کا وہاں جانا ضروری ہے۔

"I gotta go book my air ticket."

یہ کہتے ہوئے جینی نے بیگ اٹھایا۔

"Is he alright?"

میں نے پوچھا۔

"Traumatized."

اس نے میڈی کی طرف دیکھ کر مجھے جواب دیا اور بھاگتی ہوئی ہال سے اپنے کمرے کی طرف جانے والی سیڑھیوں پر چڑھ گئی۔گویا میرا اب وہاں کوئی وُجود ہی نہ تھا۔ میں نے خود کو کبھی کسی پر مسلط نہیں کیا۔مگر آج میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں جینی کو بتاؤں کہ میں بے قصور ہوں۔یہ دھماکے میں نے نہیں کرائے۔میری سات پشتوں کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔نفرتوں کی ترویج میں میرا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔دھماکوں کی بازگشت میں میری کوئی آواز نہیں ہے۔مگر میں کچھ نہیں بولا۔اس کرسی پر چپک کر بیٹھا رہا۔جو نہ مجھے ٹھنڈی لگ رہی تھی نہ گرم۔میں اس قدر سن ہو چکا تھا کہ نہ تو

کرسی کو محسوس کر رہا تھا اور نہ ہی خود کو۔حتیٰ کہ جب جینی ایک بیگ لے کر نیچے واپس آئی، میرے پاس آئی اور ذرا جھک کر مجھے الوداعی انداز میں گلے لگایا اور "See ya" کہا تو بھی میں ویسے ہی سُن رہا۔کچھ محسوس نہ کیا۔

اور وہ بوسٹن چلی گئی۔

بعد میں حواس کی بحالی پر میں نے اس کی کال پہ غور کیا تو اندازہ ہوا کہ جینی کا ڈیو سے رابطہ پہلے کا بحال تھا۔اسی لیے اسے معلوم تھا کہ وہ اب بوسٹن میں آ چکا ہے اور اکیلا ہے۔

--☆--

وہ دو ہفتے بعد واپس آئی تو میں کارنر روم میں بیٹھا ایک فلم دیکھ رہا تھا، اور اینا میرے پاس بیٹھی تھی۔جینی اندر آئی، باوجود اس کے کہ ہم (امریکی معیارات کے مطابق) بہت دور دور بیٹھے تھے جینی نے "I am sorry" بولا اور پلٹ گئی۔اینا ہنسنے لگ پڑی۔جینی اپنی بے وفائی کا ملبہ مجھ پر ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی بالکل اسی طرح جیسے میڈی نے بوسٹن میں بم دھماکے کرنے والے چیچن امریکی لونڈوں کا جرم میرے سر تھوپ دیا تھا۔

"She is too simple to think of a better way to dump you."

اینا کی اس بات پر میں نے ذرا سا غور کیا اور پھر کہا:

"All of my loves have been that simple."

پہلے تو اینا کو سمجھ نہ آئی کہ میرا اشارہ کس کی طرف تھا۔لہٰذا اس نے "Yeah" کہہ دیا۔مگر جب اسے اپنا وقت یاد آیا تو فوراً کہا:

"Oh, shut up Saleem! You and Jenny were so much into intimacies."

میں اینا سے کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔بس ہم دونوں ہنس دیے۔یہ اینا سے جدائی کا غم بھی تھا اور جینی سے جدائی کا ماتم بھی، بس اتنا سا۔میں نے فلم بند کی اور اینا سے معذرت کر کے

اپنے کمرے میں آ گیا۔

میرا ایم۔اے۔ایک ماہ سے بھی کم عرصے میں مکمل ہونے والا تھا۔ مجھے وطن، میرے شہر، میرے گاؤں اور گھر کی یاد اس قدر ستا رہی تھی کہ میں ہر وقت کھویا کھویا سا رہتا۔ مشرق سے آنے والی ہوائیں بدن کو چھوتیں تو میرا من مچل مچل جاتا۔ اینا اب بھی گنگناتی تھی مگر میں اسے کوئی خاص توجہ نہ دے سکا۔ ہر رات میرے خوابوں میں مجھے پاکستان، اسلام آباد اور کاٹھ گڑھ نظر آتے۔ کبھی کبھی منزہ بھی۔ جسے میں نے شاید دس بارہ برس کی عمر کے بعد نہ دیکھا تھا۔ وہ صورت بھی دماغ سے محو ہی ہو گئی تھی۔ سو وہ میرے کسی خواب میں جینی کی صورت میں آتی تو کسی میں اینا کے روپ میں، کبھی تاج والی لڑکی کی شکل میں تو کبھی کسی بالی ووڈ ہیروئن کے روپ میں۔ کئی بار دن میں جاگتی آنکھوں کے ساتھ میں خیالوں میں اس قدر کھو جاتا کہ خود کو منزہ کے روبرو پاتا۔

''چھوٹے۔۔۔''

''سلیم، میں اس سورج تک ایک گھنٹے میں جا سکتی ہوں۔''

''سلیم، آج آپ اکیلے آ گئے؟''

''سلیم، تم اس پینگ پر بیٹھ کے آ جانا۔''

میری غیر حاضر دماغی اس قدر وافر ہوئی کہ میری سپروائزر کو فکر لاحق ہو گئی کہ آیا میں اپنے مقالے کا ٹھیک سے دفاع بھی کر پاؤں گا یا نہیں۔

خیر جیسے تیسے کر کے میں نے ایم اے کر ہی لیا۔ پھر ایک ہفتے کی بھاگ دوڑ سے اسناد بھی وصول کر لیں۔ دفتروں کی چابیاں واپس کیں، لائبریریوں کی کتابیں لوٹائیں۔ گاڑی بیچی، سائکل میڈی کو دی کہ ہاسٹل میں آنے والے کسی ضرورت مند طالب علم کو دینا، بینک اکاؤنٹ بند کروایا، یونی ورسٹی کے شناختی کارڈ جمع کروائے، ہاسٹل کا کارڈ لوٹایا، بولڈر کا بس کارڈ واپس جمع کرایا۔۔۔اور یوں اب میرے بٹوے میں ایک ہی کارڈ رہ گیا تھا۔

پاکستان کا شناختی کارڈ۔

آہستہ آہستہ میرے محراب کا رخ بدل رہا تھا۔ تقریباً تین سال بھٹکتے رہنے کے بعد میں اپنی اصل کی طرف آ رہا تھا۔

--☆--

قسمت اب با قاعدہ میرے ساتھ مخول کرنے لگی تھی۔ عجیب و غریب اتفاقات ہونے لگے تھے۔ اِدھر جینی نے شہرِ دل کی شہریت واپس لی، اُدھر میرا امریکا کا ویزا ختم ہو گیا۔ جس دن میں نے پاکستان کے لیے روانہ ہونا تھا اسی روز جینی اپنا سب سامان باندھ کر بوسٹن جا رہی تھی۔ کرس داسکائیز کی گاڑی میں ہم دونوں کو ڈینور اِنٹرنیشنل ایئر پورٹ پر اتارنے گیا۔ سارا راستہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی جینی نے مجھ سے بات نہ کی۔ میں نے بھی کرس کے قہقہے اور ''فک'' کی پروانہ کی اور کبھی دائیں بائیں دیکھا کبھی موبائل پر پرانے پیغامات کو پڑھتا رہا۔

ڈینور ایئر پورٹ پر میں گاڑی سے اترا، کرس کو گلے ملا، اس نے تقریباً روتے ہوئے قہقہہ لگایا اور اس کے اختتام پر کہا:

"I'm already missing you, my friend. Fly safe."

ہم سامان کو چیک اِن کرا کے سیکیورٹی چیک سے گزرے تو جینی آگے جا رہی تھی اور میں پیچھے تھا۔ میں نے ویٹنگ ایریا میں ایک مقام پر اسے بیٹھتے دیکھا اور پھر عمداً اس سے دور ایک کونے میں جا بیٹھا۔ اپنے وطن کو یاد کرنے لگا۔ اس کی گلیوں کو، کھیت کھلیانوں کو، چہچہاتی چڑیوں کو۔ کہیں سے مجھے ساسا کی یاد بھی آئی اور پھر اس وقت کی جب جینی مجھے پیار کرتی تھی۔ مگر میں نے اس کے خیال کو جھٹک کر اپنے بچپن کے اسکول کا سوچنا شروع کر دیا۔

--☆--

منزہ کا گھر، اس کا اسکول اور میرا اسکول سب میرے گھر کے شمال مشرق میں ایک ہی راستے میں آتے تھے۔ ہر صبح میں اپنے گھر سے نکلتا، سیدھا منزہ کے گھر کی طرف جاتا۔ اوّل تو وہ میری منتظر گھر کی ڈیوڑھی میں کھڑی ہوتی لیکن اگر وہاں نہ ہوتی تو میں اس کے گھر کے اندر چلا جاتا اور وہ

ناشتہ چھوڑ کر میرے ساتھ چل پڑتی تھی۔ اس کا سکول آتا، وہ وہیں چلی جاتی، مگر میں اس کے اندر جانے سے پہلے ایک آخری بار اس کے پلٹ کر دیکھنے کا انتظار ضرور کرتا تھا۔

ایک بار گھر سے ہی تاخیر سے نکلنے کی وجہ سے میں بھاگتا ہوا سیدھا اسکول آ گیا اور ڈیوڑھی میں جھانک کر منزہ کو ساتھ لینا بھول گیا۔ وہ کافی دیر تک وہیں کھڑی میرا انتظار کرتی رہی۔ پھر میرے گھر جا کے امی جی سے پوچھا۔ ان کے بتانے پر کہ میں تو کب کا اسکول چلا گیا تھا۔ وہ سیدھی میرے اسکول آئی۔

میری کلاس اسکول کے اکلوتے کمرے میں دو قطاروں میں ٹاٹ پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ ماسٹر جی وہاں موجود نہ تھے۔ ایک بچہ سب کو سبق پڑھوا رہا تھا۔ وہ ہماری قطاروں کے بیچ چلتے ہوئے سبق کی ایک ٹکڑی اونچی آواز میں بولتا اور ہم سب اس سے بھی زیادہ اونچی آواز میں اسی ٹکڑی کو طوطاتے۔ وہ سبق کی اگلی ٹکڑی بولتا اور ہم اس کو بھی دوہرا دیتے۔ ایک بار آواز آئی: ''سلیم، آج آپ اکیلے آ گئے؟'' بچے اس وقت طوطیاپے میں رواں ہوئے بیٹھے تھے، سو فوراً کہا: ''سلیم، آج آپ اکیلے آ گئے؟'' میں فوراً اپنی جگہ سے اٹھا۔ اپنے ہم جماعتوں کو آنکھیں دکھائیں اور دروازے پر کھڑی منزہ کے پاس آ گیا۔ ''وہ مجھے دیر ہو گئی تھی، منزہ۔'' میں نے وضاحت دی۔

''اچھا۔'' اس نے کہا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی واپس پلٹ گئی۔

--☆--

جینی اچانک آئی اور اس انتظار گاہ میں میرے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

وہ آخری بار پلٹ کر دیکھنے آئی تھی۔ ہم دونوں خاموش رہے۔ اس کی خاموشی کی وجہ یہ تھی کہ شاید اس کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہ تھا۔ میرے پاس بہت کچھ تھا۔ مثلاً میں یہ کہہ سکتا تھا کہ جینی ہمارے ایک منصوبے کے مطابق آج تم نے میرے ساتھ پاکستان جانا تھا۔ کچھ ہی دن بعد ہماری شادی ہونے والی تھی۔ تم نے دلہن بننا تھا، مہندی لگانی تھی، اپنے ہاتھوں پر سلیم لکھوانا تھا۔ تم نے کہا تھا ''اُردُو'' میں لکھواؤں گی۔ بالیاں اور گلوبند پہننے تھے۔ دوپٹہ اوڑھنا تھا۔۔۔ مگر یہ سب کہنا

محبت کو طعنہ دینے کے مترادف تھا، کم ظرفی تھی۔ پھر لفظوں کی حرمت کا بھی تو خیال رکھتے ہیں، آنسوؤں کی پردہ داری بھی رکھنی ہوتی ہے۔

وہ مسلسل فرش کو دیکھ رہی تھی اور میں ڈینور ایئرپورٹ کی خوب صورت بادل نما چھت کو۔ جیسے ہم دونوں ایک دوسرے کو سمجھا رہے ہوں کہ ہماری دنیاؤں میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ ہم ان کی تقسیم کے محتاج ہیں۔ میں تیسری دنیا کے حصے میں آیا ہوں، تم اولین کے۔ اس بٹوارے نے ہمیں بانٹ کے رکھ چھوڑا ہے۔ مگر یہ تقسیم بہت آسان بھی نہیں ہے۔ کیا میں، میری مکمل ذات کاٹھ گڑھ کی ہے؟ کیا میں بھی بٹ نہیں چکا؟ کیا میری ذات کا کچھ حصہ اب تم سے اور بولڈر سے تعلق نہیں رکھتا؟ میری شناخت تمھاری ذات سے وابستہ نہیں ہے؟ کیا تمھاری ذات میرے بغیر مکمل ہو سکتی ہے؟

میں انہی بے ربط قسم کے سوالوں کو دماغ کے تہہ خانوں میں ڈال رہا تھا کہ جینی کے جہاز کی بورڈنگ کا اعلان ہوا۔ اچانک اسے جیسے کچھ یاد آیا ہو۔ اس نے جلدی جلدی اپنا ہینڈ کیری کھولا۔ ایک ایک کر کے تمام چیزوں کو ساتھ والی کرسی پر رکھا اور پھر آخر میں میری دی ہوئی شال نکال لی۔ 'جینی تحفہ واپس نہیں کرتے،' میں نے ڈوبتے دل سے سوچا۔ 'ہمارے ہاں اسے منہ پر مارنا کہتے ہیں۔ پلیز واپس رکھ دو۔' اس نے شال کو وہیں چھوڑا اور باقی چیزیں واپس بیگ میں رکھنے لگی۔ کیا وہ میری ایک بھی نشانی اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتی؟ پھر اس نے بیگ کو بند کیا۔ اپنی جگہ سے اٹھی، منہ دوسری طرف کیا اور میرے گاؤں کی بالکوں کی طرح شال کو اوڑھ لیا۔ میری جان میں جان لوٹ آئی۔ وہ میری طرف مڑی تو رو بھی رہی تھی اور مسکرا بھی۔ میں خوشنما حیرت میں بھی تھا اور دردِ رنجیدگی میں بھی۔ جینی آخری بار مجھے گلے ملی اور جانے سے پہلے، جانتے ہیں میرے کان میں کیا کہہ گئی؟

"We will be together in paradise."

جینی جا رہی تھی۔ میرے سامنے، مجھ سے دور۔ میرا دل، میری سوچیں، میری نظریں سب نے

اس کی انگلیاں پکڑلیں، اس کے ساتھ ہو لیے۔ سوائے آنسوؤں کے جو دیرِ دید سے نکلتے ہی منہ کے بل گرتے، میرے چاک گریباں میں اتر جاتے۔ خدا کرے کہ کبھی کوئی کسی سے یوں بٹ کر نہ بچھڑے۔ کسی کو اپنے آدھے آپ سے اپنے دل جیسے ہیرے کو الوداع نہ کہنا پڑے۔

جینی مرگِ محبت کا جشن دیکھنے کے لیے ایک مرتبہ رکی، مڑ کے دیکھا، مسکرا کر ہاتھ ہلایا اور پھر اُس جہاز کی طرف چل دی جو امریکہ کی ہواؤں کو چیرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے قرب میں بھی کبھی نہ بھرنے والی دراڑ ڈال گیا۔

--☆--

"Do you have good internet in Pakistan?"

میں ابھی وہیں بیٹھا تھا کہ میرے موبائل پر جینی کے باپ کا پیغام آیا۔

"Yes, Mr. James. We have quite a speedy net."

میں نے خلافِ واقعہ کہا۔

"N I hope things are not banned. Are they?"

"Oh, Mr. James!"

"Hahaha... Have a nice trip, man. I am sorry for you. You are a good man. You brought real happiness to my daughter's life. Though temporarily so."

مسٹر جیمز نے ایک بار پھر اپنی زندہ دلی کا ثبوت دیا۔ مذاق کی صورت نکالنے کی کوشش کی اور مجھے اپنا پرانا مذاق یاد دلا کر ہنسانے کی کوشش کی۔

"Bye :)"

--☆--

﴿۱۸﴾

میرا جہاز ڈینور کی سرزمین سے جدا ہوا اور کولوراڈو کی فضاؤں میں بلند ہو کر شکاگو کی طرف اڑان بھرنے لگا۔ ونڈو میں سے مَیں بولڈر کی طرف جھانک رہا تھا۔ بولڈر، جہاں میرا عرقِ بدن ہواؤں کے دوش تھا، میری ذات کا کچھ حصہ، میرے وجود کی کچھ حقیقت بکھری پڑی تھی۔ جہاں میرے قہقہے ہاسٹل کے کارنر روم میں گونج رہے ہوں گے، میری تلخ و شیریں باتیں ڈائننگ ہال کی میز پر سنائی دے رہی ہوں گی، میری بانسری کی دھنیں بیس بال کے میدان میں مچل رہی ہوں گی۔ میری شرارتیں میڈی کے کچن میں مسکرا رہی ہوں گی اور میری حسرتیں...... میری حسرتیں ساسا کی قبر میں مدفون ہوں گی۔ ڈورر اکی ماؤنٹین تھا۔ اسی احسان فراموش پہاڑ میں مَیں اپنا مان، اپنا پیار، اپنی جستجو سب کچھ لٹا کر جا رہا تھا۔

میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی خاتون، محبت کی دھوپ چھاؤں سے واقف لگ رہی تھی۔ اس کی متفکر پیشانی سے صاف ظاہر تھا کہ وہ میری دل گرفتگی کو بھانپ بیٹھی ہے۔ معاملے کی تہہ تک پہنچنا انسانی جبلت ہے لیکن چاہتے ہوئے بھی میں اس کے تجسس کا علاج نہ کر سکا اور اپنی سوچوں کی گھنی اندھیری میں ڈولتا ڈگمگاتا رہا۔

بلاشبہ میرے دل اور میری روح کا کچھ حصہ کولوراڈو یونی ورسٹی میں اور کچھ داسکا ئیز ہاسٹل

میں رہ گیا تھا، اور کچھ رنگ اور نور کی اُس جنت نظیر وادی میں جس نے اپنی آرائشِ جمال کے لیے جینی اور مجھ سے ہماری محبت کا نیلا رنگ چھین لیا تھا۔ سو میرے حصے میں اپنے آپ کا بہت ہی کم حصہ آیا تھا، جسے میں ایگل ایئر کی ونڈو سیٹ پر بے دھیان چھوڑ کر ساتھ بیٹھی امریکی عورت کے تجسس کی چابی بھر رہا تھا۔

اس ادھورے پن میں ایک طمانیت سی بھی تھی۔ میرے دل اور روح میں جو خلا پیدا ہوا تھا وہ خالی نہ رہا۔ اس میں کہیں وادیِ خواب کا حسن تھا، کہیں گارڈن آف گاڈز کی چٹانوں کا، کہیں جینی کی محبت تھی تو کہیں اینا کا پیار، کہیں میڈی کا سرد گرم کا مرکب رشتہ تھا تو کہیں کرِس کا وہ خلوص بھرا قہقہہ، جو ہمیشہ پتلی آواز میں "Fu**" پر منتج ہوتا۔ آج ہاسٹل میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو میرا دوست نہ ہو۔ فیس بک پر میری ایک الوداعی تحریر کو دیکھ کر آج صبح تقریباً سبھی مجھے الوداع کہنے آئے۔ سبھی کی آنکھیں نم تھیں۔ میرے ساتھ ان سب کی محبت جا رہی تھی۔ یہ الگ بات کہ محبت کی جس جنس کی تلاش میں مَیں آیا تھا اس میں اور جو میں سمیٹ کر جا رہا تھا اس میں فرق زمین آسمان کا تھا۔ میری ہم نشست نے میرے چہرے پر رونق لوٹتے دیکھی تو سکون کی سانس لی اور آنکھیں بند کر کے سر پیچھے سیٹ پر ٹیک لیا۔

شکر ہے اس نے آنکھیں بند کر لیں تھیں ورنہ وہ میرے چہرے کا ایک اور رنگ دیکھتی۔ جلالی رنگ۔ ایئر ہوسٹس نے مجھے ٹرے پکڑانے کی کوشش کی تو میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ معلوم نہیں کہ مجھے کیا ہوا کہ میرے جی میں آیا اسے کہوں دفع ہو جاؤ الو کی پٹھی۔ نہیں کھانے مجھے تمھارے یہ پکوان۔ اگر تم لوگ مجھ سے اپنی سوغات، اپنی محبت نہیں بانٹ سکتے تو رکھو اس ٹرے کو بھی اپنے پاس۔ وہ پلٹ گئی تو میں نے ذرا مستقبل کی طاق میں جھانکنے کو آنکھیں بند کیں۔ اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ خدا کی پناہ۔

کولوراڈو سے لے کر کاٹھ گڑھ تک گھپ اندھیرا تھا۔ میرے چہرے کی رونق ایک مرتبہ پھر فق ہو گئی۔

--☆--

شکاگو ایئر پورٹ کے ویٹنگ ایریا میں جہاں سے ابوظہبی کے جہاز نے اڑان بھرنی تھی زیادہ ہندوستانی بیٹھے تھے۔ یکے بعد دیگرے پانچ سات لوگوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں حیدر آباد دکن سے تھا۔ جیسے ان کے دکن کا کوئی لمبا تڑنگا لڑکا لڑکپن میں کھو گیا ہو، اور بسوں، رکشوں کے پیچھے لگے پوسٹروں والی تصویر مجھ سے مماثلت رکھتی ہو۔ اس کی بھی آنکھیں بھوری ہوں، گھنے سیاہ بال ہوں، رنگ سرخ و سفید ہو، ناک ستواں ہو اور سینا چوڑا ہو۔ اسی طرح کے ایک سوال پر جب میں نے نفی میں سر ہلایا اور سامنے والی خاتون کو زچ ہو کر بتانے لگا کہ نہیں میڈم میں اسلام آباد سے ہوں تو سامنے والی کرسیوں کی قطار میں دائیں طرف ایک لڑکی بیٹھتے بیٹھتے رک گئی اور مڑ کر میری طرف دیکھا۔ پل بھر کے لیے میری نظر اس کے چہرے پر پڑی اور پھر وہ وہیں دوسری طرف منہ کر کے بیٹھ گئی۔

میرا دل عجب ناسمجھی سے مچلنے لگا۔۔۔خواہ مخواہ۔۔۔میں نے چپکے سے اسے کوسا کہ ابھی پرانے زخم تو بھر جانے دو، ظالم۔ مگر وہ مچلتا ہی گیا۔ جیسے اسے اس کا نقشِ مراد مل گیا ہو۔

میرے دائیں طرف بیٹھی ایک خاتون نے مجھے اپنے بارے میں تفصیلاً بتانا شروع کر دیا کہ وہ کراچی سے تھی اور وہ پانچ بہن بھائی تھے۔ دونوں بھائی کراچی میں رہتے تھے جب کہ تینوں بہنیں ہیوسٹن میں۔ اس نے اپنی بارہ سالہ بیٹی کا تعارف کرایا۔ وہ تقریباً اسی عمر میں تھی جس میں میں نے منزہ کو آخری بار دیکھا تھا۔ بچی نے بہت ہی ادب کے ساتھ ''السلام علیکم'' بولا اور اپنا دایاں ہاتھ پیشانی کی طرف لے گئی۔ اس کے اس عمل کو دیکھ کر ماں نے یوں ستائش سے سر ہلایا جیسے بیٹی نے پہلی بار کوئی بڑا امتحان پاس کیا ہو۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور ماں بیٹی کے سامنے کھڑے ہو کے بچی سے پوچھنے لگا کہ اسے کراچی اور ہیوسٹن میں سے کون سی جگہ زیادہ پسند تھی؟ بچی نے مجھے حیران کرتے ہوئے خوب صورت اردو میں بے انتہا اعتماد سے کہا: ''مجھے دونوں شہر بہت عزیز ہیں۔ میرے جسم کے لیے ہیوسٹن، جب کہ روح کے لیے کراچی۔'' میرا اگلا سوال فطری تھا۔ ''آپ

شاعری واعری تو نہیں کرتیں؟'' اس پر اس کی آنکھیں چمکیں اور سر اثبات میں ہلنے لگا۔ وہ ابھی
میرے اندازے پر حیران ہی بیٹھی تھی کہ اس کی ماں بول پڑی: ''صبا گزشتہ تین برس سے مسلسل
کراچی ادبی میلے میں جا رہی ہے۔ اسی کی وجہ سے اس کی دو کزنوں کی شادیاں فیسٹیول کے دنوں
میں رکھنی پڑیں تاکہ ہمیں ایک ہی سال میں دو، دو چکر نہ لگانے پڑیں۔ ایک تو ٹکٹ اتنے مہنگے ہو
گئے ہیں۔۔۔''

یہ میرا پسندیدہ موضوع تھا اور میں اس پر تفصیل سے بات کر سکتا تھا۔ مگر اس وقت میرا دماغ
میرے پیچھے بیٹھی لڑکی کی طرف تھا۔ سو میں وہیں کھڑا مسکراتا رہا اور اس شاعرہ بچی اور اس کی ماں
کی باتیں سنتا رہا۔ کچھ دیر بعد میں نے ارادہ باندھا کہ اب مجھے اس کے پاس جانا ہے۔ مگر مڑ کر
دیکھا تو لڑکی وہاں نہیں تھی۔ وہ کیا، وہاں اس کے فرشتے بھی نہ تھے۔ میں اس قدر جھنجھلاہٹ اور
بوکھلاہٹ کا شکار ہوا کہ شاعرہ اور اس کی والدہ کو لگا کہ میرا کچھ قیمتی سامان گم ہو گیا ہے۔ یہ تاج والی
لڑکی کو کیا تھا؟ یہ کوئی حقیقی انسان تھی بھی یا کوئی جن پری یا میرا واہمہ تھی؟ یوں بار بار سامنے آ کے
چھپ جانے کا کیا مقصد تھا؟ میں مایوس ہو کر اپنی سیٹ پر ڈھے گیا اور دائیں طرف کھڑی اتحاد ایئر
لائن کی ایئر بس کو دیکھنے لگا جس پر کچھ ہی دیر بعد اس ویٹنگ ایریا میں بیٹھے تمام لوگوں نے سوار
ہونا تھا۔ اُس تاج والی لڑکی سمیت۔ کیا ہی اچھا ہو کہ وہ مجھے جہاز میں مل جائے۔ مگر کیا یہ ممکن تھا کہ
میں اسے اتنے بڑے جہاز میں تقریباً پانچ سو لوگوں کے بیچ ڈھونڈ سکوں؟ کیا تیرہ گھنٹوں کی فلائٹ
میں فرداً فرداً پانچ سو لوگوں کے چہرے ٹٹولے جا سکتے ہیں؟ شاید ابوظہبی ایئر پورٹ پر ملاقات
ہو جائے۔ کولوراڈو سے کاٹھ گڑھ تک پھیلے ہوئے گھپ اندھیرے میں امید کی ایک موہوم سی کرن
ٹمٹمانے لگی۔

--☆--

۱۹

جہاز کے اندر پہنچ کر میں نے ہینڈ کیری اور لیپ ٹاپ کو سیٹ کے اوپر ڈبے میں رکھا اور اپنی سیٹ
کے بجائے بائیں ہاتھ والی ونڈو سیٹ پر براجمان ہو گیا۔ ایک طویل فضائی سفر میرا منتظر تھا۔ سرِ راہ
سیکڑوں بدلیوں کی زیارت کرنی تھی۔ اٹلانٹک کے آبی بخارات میرے سفینۂ سفر کو لپٹ لپٹ
جائیں گے۔ سمندری حیات کے رزق سے سیر ہو کر بگلے اونچی اڑان بھریں گے تو اس ونڈو سے
جھانک جھانک دیکھیں گے۔ میری آنکھوں میں لکھے افسانۂ محبت کو پڑھیں گے اور پھر نیچے جا کے
پانیوں کی چوپالوں پر، سمندر واسیوں کے قصہ گو بن کر انسانوں کے معاشرے میں زوالِ محبت کی
داستان سنائیں گے جیسے ہمارے قصہ گو کوّوں اور لومڑیوں کی سبق آموز کہانیاں سناتے ہیں۔ پھر
یورپ آئے گا۔ وہ یورپ جس نے ہماری دنیا کو مہذب کرنے کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھایا
تھا۔ میرا سفینہ اندلس اور انگلستان کی لائبریریوں کے اوپر سے پرواز کرتا ہوا مجھے میرے مسکن کی
امان میں لے آئے گا۔ اس لمبے سفر میں اِسے کئی بار بادِ مخالف سے لڑنا ہو گا۔ جینی اور اینا کی یادوں
کی طرح یہ ہوائیں مجھے واپس بولڈر لے جانے کی سازشیں بُنیں گی۔ ایسے ایسے زاویوں سے وار
کریں گی کہ میرا جہاز ہچکولے کھانے لگے گا۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں اور سفر کی دعا پڑھی۔ پھر آیت الکرسی پڑھی، کچھ اور ذکر اذکار
کر کے خود پر پھونکا، سامنے کاک پٹ کا رخ کر کے اپنے تئیں پائلٹ پر پھونکا، پھر دائیں طرف

بیٹھے ہوئے مسافروں پر......

''دھاڑ دے......''

وہ تاج والی لڑکی!!!!

تاج والی لڑکی میرے پاس آ بیٹھی تھی!!!!

اس قدر قریب آ کے بیٹھ گئی تھی کہ جب باقیوں تک پھونک کا ذرہ بھی نہ گیا ہوگا، اس کے منہ پر دو چار قطرے تھوک کے بھی پڑ گئے۔ اس نے اپنے منہ پر تو ہاتھ رکھ لیا مگر آنکھوں کو مسکرانے سے نہ روک سکی۔

''یہ ونڈ وسیٹ..........'' میں گلا صاف کر کے بولا ''یہ ونڈ وسیٹ آپ کی تھی؟''

''جی، مگر نو ایشو، آپ بیٹھے رہیں۔ ویسے بھی جہاز میں کم لوگ ہیں، لگتا ہے کافی نشستیں خالی رہیں گی۔ میں کہیں اور بیٹھ جاؤں گی۔''

'ایسا مت کرنا پلیز ورنہ میں بھی وہیں آ بیٹھوں گا۔' میں نے سوچا۔ پھر سوچے سمجھے بغیر اسے یہ بتا بیٹھا کہ میں نے اسے تاج پر دیکھا تھا اور یہ بھی کہ میں اس کے بعد بھی کئی بار تاج پر گیا تھا۔ ظاہر ہے یہ ایک احمقانہ سی بات تھی۔ ریستورانوں پر سیکڑوں لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ ویٹروں کو وہ سب یاد تھوڑی ہوتے ہیں اسے خاموش دیکھ کر میں نے اسے یاد دلانا چاہا کہ میں ایک بار آیا تو اسے ہندوستانی لڑکی سمجھ کر بالی ووڈ کی ہیروئنوں کے گن گائے تھے اور......

''جی مجھے یاد ہے وہ سب......'' اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔

اسے جینی بھی یاد تھی اور یہ بھی کہ وہ جلدی جلدی کھانا کھا رہی تھی اور میں باتیں کیے جا رہا تھا۔ اس پر میں نے اسے بتایا کہ آپ کی یادداشت بہت اچھی ہے۔ اتنی اچھی یادداشت یا تو میری امی کی تھی اور یا پھر میری بچپن کی دوست منزہ کی جو......

''جینی کہاں ہے آج کل؟'' اس نے پھر میری بات کاٹی۔

''وہ بوسٹن میں ہے......'' میں نے کہا اور سوچنے لگا کہ یہ تاج والی لڑکی میری اور جینی کی دوستی کے

بارے میں کچھ زیادہ ہی پرامید ہے۔

''تو پاکستان کب آئے گی؟...... یا آپ خود ہی بولڈر لوٹ آئیں گے؟'' اس کے چہرے پر مسکراہٹ اب بھی روشن تھی اور اس کے لہجے میں اس قدر اثبات تھا کہ مجھے جھوٹ بولنا پڑا۔

''وہ آئے گی...... وہ ضرور آئے گی۔ وہ تو ابھی ساتھ جانے کی ضد کر رہی تھی مگر آپ جانتی ہیں وہاں کے حالات...... اور لوگوں کی سوچ، سو میں نے سوچا کہ پہلے ذرا انتظامات کر لوں پھر بلا لوں گا۔''

پھر اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے کوئی اور سوال پوچھ کر مزید جھوٹ بلواتی میں نے کوتوال کے ڈانٹنے کی ٹھانتے ہوئے پوچھا کہ آپ سنائیں بولڈر میں بھارتیوں کے ریستوران پر نوکری کے علاوہ اور بھی کچھ چل رہا تھا کہ نہیں۔

''جی دراصل میں وہاں ایک ایکسچینج پروگرام پر آئی تھی اور ایک اسکول میں انگریزی پڑھا رہی تھی...... اور رہا سوال بھارتیوں کا تو وہ میرے اپنوں سے بھی بڑھ کر اپنے ثابت ہوئے۔ انھوں نے مجھے نہ صرف کام دیا بلکہ اپنے گھر میں بیٹیوں کی طرح رکھا۔''

''واہ، بہت اچھے......'' میں نے ایک ٹکے کا بھی یقین نہ کرتے ہوئے کہا۔ پھر ان لوگوں کی مزید تعریفیں سننے سے بچنے کے لیے میں نے اسے بتایا کہ انگریزی مَیں بھی پڑھا تا رہا ہوں۔ اسے انگریزی میں اپنے دو ایم۔ اے۔ کا احوال بھی بتایا اور پھر ساسا ساسی کی محبت کی لازوال داستان بھی سنائی۔ اس دوران میں جہاز نے رن وے پر محبت کے منجھے ہوئے کھوجی کی طرح اپنا قبلہ درست کیا، ہم نے بے خیالی میں سیٹ بیلٹ باندھے، جہاز نے دوڑ لگائی اور آسمان کی نیلگوں وسعتوں سے باتیں کرنے لگا۔ جب کہ میں اس تاج والی لڑکی سے۔ باتوں کی روانی تھی یا جذبات کی رو، میں اسے سب کچھ بتاتا گیا۔ مثلاً یہ کہ بنیادی طور پر وہاں تلاشِ محبت کے لیے گیا تھا۔ جیسے بنجر صحراؤں کے لوگ عرب میں تلاشِ رزق کے لیے چلے جاتے ہیں۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ مجھے جس سے محبت تھی وہ وہیں تھی کیا۔ تو میں نے ہاتھ گھما گھما کر کہا کہ مجھے پہلے تو یہ احساس نہ

تھا مگر میرا دل کہتا تھا کہ وہ دور دیس میں ہے۔ سات سمندر پار ہے۔

''یہ تو تلاش محبوب ہے۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔ ''اسے تلاشِ محبت تو نہ کہیں ناں۔ تلاشِ محبت تو تب ہوتی اگر آپ کو وجودِ محبوب کا ادراک ہوتا۔''

تاج والی لڑکی فلسفۂ محبت میں طاق لگ رہی تھی۔ جتنا وقت سیٹ بیلٹ کو کھولنے میں لگتا ہے بس اتنے ہی عمل میں اس نے سوالِ محبت کی وہ گرہ کھول دی جو میرے گاؤں میں آنے والی نیلی چڑیوں اور رُوسی کونجوں نے باندھی تھی اور میرے سفرِ محبت کو پیچیدہ کر گئی تھیں۔

''محبت دور دیس، اُفق کے اس پار بھی ہو سکتی ہے مگر محبوب کی تمیز نہ ہونا راہی بے منزل کی طرح بھٹکتے رہنے کے مترادف ہے۔'' اس نے حتماً کہا۔

''خیر یہ بتائیں کہ آپ کے مشغلے کیا ہیں، پسندیدہ چیزیں کیا ہیں، خواہشیں خواب کیا ہیں؟'' فلسفے میں مات ہو جانے پر میں نے پوچھا۔

''میرا مشغلہ ادب ہے ...... اور پسندیدہ چیزیں...... مجھے بارش اچھی لگتی ہے، قوس قزح بھی، آسمان کا نیلا رنگ بھی......اور کھانے میں مجھے ساگ پسند ہے......اور چاندنی رات تو مجھے پاگل ہی کر دیتی ہے......''

میرا رونے کو جی چاہ رہا تھا۔ اس نے اک آہ بھری اور کہا:

''میری خواہشیں کئی ہیں چھوٹی چھوٹی۔ ایک یہ کہ کبھی کشتی میں سفر کروں، کبھی سمندر کے کنارے چلتے چلتے دور تلک چلی جاؤں۔ کبھی کوئی چاندنی رات چولستان کے ڈیپ ڈیزرٹ میں بسر کروں، کسی گڈریے کے ساتھ تھل کی چراگاہوں میں بھیڑیں چراؤں، بانسری بجاؤں......''

یہ لوری جیسی باتیں کرتے کرتے وہ یوں اطمینان سے سو گئی کہ جیسے برسوں بعد سو رہی ہو۔

جہاز کے فضا میں بلند ہوتے ساتھ ہی تیں امریکہ کے سمندر سے باہر آ چکا تھا۔ وہ سمندر جس نے اپنے اندر کئی جہانوں کی آسودگی سموئی ہوئی ہے، یقیناً ایک اچھال کی قوت بھی رکھتا تھا۔ اسی buoyancy کی بہ دولت میں اس کی طوفان انگیز لہروں سے الگ ہو گیا تھا اور

معلوم نہیں کیوں اس جہاز میں تاج والی لڑکی کے پہلو میں بیٹھے بیٹھے مجھے لگا کہ میں ڈوبتے ڈوبتے بچا ہوں۔ کچھ یادوں کا تاوان دے کر دل بازیاب کرا آیا ہوں۔ اچانک میں اک خوشی سے سرشار ہو گیا۔ اک عجیب سی مستی طاری کر دینے والی خوشی جو دراصل زمینِ درد سے پھوٹتی ہے۔ میں یوں مسکرایا جیسے کوہ پیمائی کا کوئی شیدائی اوالانچ سے نکل آنے کے بعد سوکھے ہونٹوں سے مسکرا دے یا جیسے کئی روز تڑپتے رہنے کے بعد پہلو میں لیٹے بچے کے رونے پر کوئی زچہ مسکرا دے۔ تاج والی لڑکی گہری نیند کی آغوش میں سمٹی ہوئی تھی۔ اُس کا کمبل اس کی گود میں تھا۔ میں نے اپنا کمبل کھولا اور بہت ہی احتیاط کے ساتھ اس کے سر اور کاندھوں کے گرد لپیٹ دیا اور خود سامنے لگی اسکرین پر شاہ رخ خان کی فلم ''جب تک ہے جان'' دیکھنے لگا۔ میں فلم میں ہی کھویا ہوا تھا کہ نیند میں اس کا سر ڈھلک کر میرے سینے سے آ لگا۔

سامنے اسکرین پر اس وقت فلم کا گانا ''جھلا کی لبھدا پھرے'' لگا ہوا تھا۔

میں نے اپنے آپ کو بہت دھیان کے ساتھ یوں ایڈجسٹ کیا کہ میرا دایاں کندھا اس کا سرہانا بن گیا۔ اس کے بالوں کی خوش بو میری سانسوں میں اتری تو میں نے سوچا کہ میں نے بھی کیا جستجو کی۔ اپنے ملک سے دور، سات سمندر پار جا کر محبت کو دریافت کرنے میں جتا ہوا تھا۔ کیا یہ حسین لڑکی، جینی یا اینا سے کم ہے؟

ایک مقام پر ایئر پاکٹ کی وجہ سے یا شاید اُن سازشی ہواؤں کی شرارت کی وجہ سے اتنا شدید ٹربیولینس آیا کہ جہاز ہچکولے کھانے لگا۔ تاج والی لڑکی جاگ گئی اور ''سلیم!!'' کہہ کر میرے ہاتھ کو پکڑ لیا۔ ''پریشان مت ہوں، کچھ نہیں ہوا۔'' میں نے اسے تسلی دلاتے ہوئے کہا۔ اس نے پوری آنکھیں کھولیں۔ ارد گرد دیکھا۔ میرا کمبل اتار کر مجھے دیا اور آہستہ سے کہا:

"Thank you!"

یہ خوابیدہ آواز اس قدر مدھر تھی کہ اس پر میں اوّل سے لے کر اب تک کی اپنی ساری نسلوں کی محبت بھی لٹاؤں تو اس کی تحسین کا حق ادا نہ ہو گا۔

"You're welcome." میں نے مسکرا کر کہا۔ ایک بار اونچی آواز میں اور کئی بار دل میں۔

اسے پھر سے سونے کے لیے تیار ہوتے دیکھا تو مجھ سے رہا نہ گیا۔

''آپ۔۔۔'' اس کی آنکھوں میں حسن یوں جھلملایا کہ میرا جملہ 'آپ' پر ہی ٹوٹ گیا۔

''آپ کو نیند آ رہی ہے؟'' دوسری کوشش پر بھی میں نے جملہ بڑی مشکل سے یوں ادا کیا جیسے غریب قرض ادا کرتا ہے۔ اس نازنین کے آگے میری زبان افسوں زدہ تھی۔

''جی......'' اس نے انتہائی بے نیازی سے کہا۔

یا خدایا، یہ کیا ماجرا ہے؟ اس کی آواز اور آنکھیں تھیں کہ کشش کی ساری سائنس کو مات دیے جا رہی تھیں جب کہ تکلم تھا کہ اس کائنات کا سب سے بڑا دافع بنا ہوا تھا۔ میں بھی حرف کی حقیقت خوب جانتا تھا۔ آنکھیں بول رہی ہوں تو ہم دل والے لفظوں پر کہاں کان دھرتے ہیں۔ دل دھڑکنوں کے بول بول رہے ہوں تو دماغ کے ساتھ کون سر کھپاتا ہے۔ اس وقت اس نے سرمئی رنگ کا ان فلائٹ بلینکٹ اوڑھ رکھا تھا۔ میری سیٹ کی ریڈنگ لائیٹ آن تھی۔ سرخی مائل اجالے میں اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ ''کیا دیکھ رہے ہیں؟'' اس نے مست سی آواز میں پوچھا۔ بے خیالی میں مَیں اپنے ہونٹ اس کے کانوں کے پاس لے کر گیا اور آہستہ سے کہا:

''لگتا ہے کبھی محبت نہیں کی آپ نے......''

یہ سنتے ہی اس کی آنکھوں میں اک آگ کا شعلہ لپکا۔ فوراً سر سیٹ کے بازو سے اٹھا کر وہ سیدھی ہو کے اٹھ بیٹھی۔ ایک بار پھر میری طرف غصے سے دیکھا۔ جیسے کہہ رہی ہو میری محبت سے تمہارا کیا لینا دینا یا شاید یہ کہہ رہی تھی کہ 'تمہیں تو یہ بھی معلوم نہیں محبت کرنے والوں کی شناخت کیسے کی جاتی ہے۔'

اپنی اپنی سی اس انجانی لڑکی نے میرے نازیبا سوال کو نظر انداز کیا اور دھیرے سے کہا:

''آپ نے کی؟''

''جی۔'' میں نے چوڑا ہو کے کہا۔

''جینی سے؟''

''جی۔''

''مزہ آتا ہے ناں؟''

''جی۔''

''آپ دنیا کے خوش قسمت ترین شخص ہیں۔'' اس نے اپنے پیروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس وقت اس کے چہرے پر وہ معصوم حسرتیں آ کے خیمہ زن ہوئیں کہ ہلکی سی آہ بھی کرتی تو یہ ایئر بس پانچ سو مسافروں سمیت سیدھی اٹلانٹک میں جا گرتی۔

''آپ محبت کی تلاش میں نکلے اور محبت بھی پا لی، محبوب بھی ڈھونڈ لیا۔ محبت کے سفر کے کولمبس ہیں آپ۔ مجھے آپ پر رشک آتا ہے۔ میں آپ کی محبت کے دوام کے لیے دعا کروں گی، ہمیشہ۔'' آخری جملہ بولتے ہی اس نے ایک بار پھر سیٹ کے بازو پر تکیہ رکھا، کمبل اوڑھا اور سونے لگی۔

''سچ بتاؤں؟''

میں نے اس سے باتیں کرنی تھیں۔ ویسے بھی بحر اٹلانٹک کے شفاف پانیوں کے اوپر اڑتے جہاز میں مَیں اور کب تک ڈپلومیٹک رہتا۔

وہ رُکی۔

''جینی سے میری محبت ایک خواب سے بڑھ کر کچھ نہیں تھا۔''

''اچھا سونے دیں مجھے۔'' اس نے مان سے کہا۔

''اس کے اور میرے بیچ ثقافتوں کے دو براعظم حائل تھے، جو برسات کے مینڈکوں کی طرح عام دنوں میں نظر نہیں آتے مگر جوں ہی حالات کروٹ لیتے ہیں اس شدت سے دھاڑتے چنگھاڑتے ہیں کہ محبت کے کانچ محل میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔'' میں نے اس کی منتوں کی پروا نہ کی اور بات

جاری رکھی۔

اب وہ ہمہ تن گوش تھی۔ تکیہ اس کے سینے سے لپٹا ہوا تھا۔ میری بات کے انجام پر اس کا سر ذرا سا ڈھلکا اور ٹھوڑی تکیے سے مس ہوئی، نرمی اور نفاست نے معانقہ کیا۔

''محبت کی دوشالہ ریشم کے دھاگوں سے بُنتی ہے۔ رنگ، نسل، قومیت، اور مذہب کا فرق اس میں چھید کرتے ہیں...... مگر سارا مسئلہ جینی کی طرف سے تھا۔'' جھوٹ نے ایک بار پھر مجھ غریب پر دوگزہ ڈالا۔ ''میں تو کھلے دل اور دماغ کا بندہ ہوں۔ مجھے اس کے دین، دھرم، کلچر، زبان سے کوئی ایشو نہیں تھا؛ شروع میں اسے بھی کوئی اعتراض نہ تھا مگر بعد میں دودِلی ہوگئی۔ ہمارے تعلق میں دراڑ پڑی تو ہم نے فوراً اپنی اپنی راہ لی۔''

''اوہ۔'' اس نے بس اتنا سا افسوس کیا۔ ''تو آپ کا پہلے والا ایم۔ اے۔ کہاں سے تھا؟'' وہ گفت گو کو کسی منطقی انجام تک پہنچانا چاہ رہی تھی۔

''دمل سے۔ مگر مَیں جب وہاں تھا تو میری منطقِ محبت اس قدر اٹل تھی کہ وہاں نہ مجھے کوئی نظر آئی اور نہ میں کسی کو نظر آیا سو وہاں کوئی چانس نہیں ہے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''پھر اب کیا ارادے ہیں، جناب؟'' تاج والی لڑکی پوری طرح جاگ چکی تھی اور اب میری صورت حال سے محظوظ بھی ہو رہی تھی۔

''ارادے نیک ہیں، بس تلاش جاری رکھیں گے، کبھی تو کوئی ملے گی ہمیں بھی......''

''مجھے تو لگتا ہے آپ کا کچھ نہیں ہو سکتا۔'' اس نے شرارت بھرے لہجے میں جلدی جلدی کہا تو ہم دونوں ہنسنے لگے۔ پھر ذرا سی دیر کے بعد میں نے کہا ''ایک بات بتاؤں آپ کو؟''

''ہوں، ہوں''۔

''آپ کی پسندیدہ چیزیں، آپ کی باتیں، آپ کے چہرے کی معصومیت سب میری بچپن کی دوست منزہ سے ملتی ہیں......''

میں گلا صاف کرنے کے لیے رکا۔ ایک گہری سانس لی اور کہا: ''میں نے اسے کہیں کھو دیا۔ بچپن ہی

[illegible] مگر اس کی یادیں ہر پل میرے ساتھ ہیں۔''

یہ حسد تھا کہ رشک کہ اس کے ہونٹ بھنچ گئے اور تکیہ اس کے بازوؤں کی گرفت میں بے دم ہوتا گیا۔

''آپ نے کبھی اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں...... یہ خیال میرے دل میں کئی بار آیا مگر پھر یہ سوچتا ہوں کہ شادی تو ہو نہیں سکتی، رابطہ کرنے کا فائدہ؟''

''اس سے شادی کیوں نہیں ہو سکتی؟''

''وہ شیعہ ہے!!'' میں نے اٹل انداز میں کہا۔

''جینی سُنی تھی؟'' اس نے فوراً پلٹ کر کہا۔

تاج والی لڑکی کے اس سوال کے لیے میں تیار نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے جہاز کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ سورج اٹلانٹک کے پانیوں کے اوپر کہیں سے اُگنے لگا تھا۔ اُس کا اُجالا اِن کی سطح سے سیاہ چادر اتار کر کہیں نیلے تو کہیں نارنجی غلاف بچھا رہا تھا۔ اس وقت شاید ہم نقطۂ محبت کے عین اوپر تھے۔

''وہ تو خیر...... یہ تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں۔'' میں بہ دستور کھڑکی سے باہر پانیوں کو ہلکے نیلے رنگ میں بدلتے دیکھتا رہا۔

''میں اسے جا کر تلاش کروں گا۔''

وہ خاموش رہی۔

''اور اگر بالفرض وہ مجھے نہ ملی یا اس کی شادی ہو چکی ہوئی تو آپ تیار رہنا۔''

میں نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ میرے مذاق سے لطف اندوز ہونے کے بجائے اس نے مجھے غصے سے دیکھا۔

اُف خدایا، یہ میں نے اسے کیا کہہ دیا تھا؟ کون عورت ایسی ذلت برداشت کرے گی۔ فلاں نہ ملی تو تم تو ہو ناں۔ محبت تو میں فلاں سے کرتا ہوں مگر آپ بھی چل جائیں گی۔ میری عقل

کوشاید کولوراڈو کی خشکی چاٹ گئی تھی۔ میں نے اس سے معذرت تو کی مگر اس کے بعد تاج والی لڑکی نے مجھ سے بات نہ کی۔ بل کہ کچھ دیر کے بعد وہ اپنی سیٹ سے اٹھی۔ اوپر رکھے اپنے بیگ سے ایک خوب صورت کوور والی کتاب اٹھائی اور مجھ سے کچھ کہے بغیر پیچھے والی سیٹ پر جا بیٹھی۔

--☆--

﴿۲۰﴾

میں نے ''جب تک ہے جان'' کے دو تین پسندیدہ سین دوبارہ دیکھے، ایک دو گانے سنے، دو مرتبہ بیل دے کر پانی منگوایا، کمبل اوڑھا اور سونے کی کوشش کی مگر نیند گویا مجھ سے روٹھی بیٹھی تھی۔ تاج والی لڑکی کی دل آزاری میرے دل کو ماند کیے رہی۔ میں اپنی سیٹ سے اٹھا اور پیچھے کی طرف والے باتھ روم کو گیا۔ وہاں آئینے میں خود سے آنکھیں چار ہو گئیں۔ ایک مدت کے بعد احساسِ جرم میری پیشانی کو بل دیے بیٹھا تھا اور رتجگا میری آنکھوں میں سرخی گھولے کھڑا تھا۔ میں سب کچھ کو نظر انداز کر کے کموڈ پر بیٹھ گیا۔ اور کموڈ پر بیٹھتے ہی، جیسا کہ سب کے ساتھ ہوتا ہے، مجھے ہمیشہ کوئی ہنسی نکال دینے والی بات یاد آ جاتی ہے۔ آج مجھے اپنے کزن علی کی بچپن کی ایک شرارت یاد آئی جو وہ اکثر منزہ کو چھیڑنے کے لیے کرتا تھا اور پھر مجھ سے خوب مار بھی کھاتا تھا۔ وہ ایک گانے کو توڑ مروڑ کر اپنی بے سری آواز میں گنگناتا ہوتا تھا:

''تُو پسند ہے تسی اور تی، تُو پھنسی ہوئی تہیں اور ہے......''

میں ہنستے ہوئے باہر نکلا تو ایک ایئر ہوسٹس جو گذشتہ کئی گھنٹوں سے آتے جاتے میری بدلتی ہوئی کیفیات کو دیکھ رہی تھی، یوں زیر لب مسکرا دی جیسے اسے اب میرے پاگل ہونے کا پکا یقین ہو گیا ہو۔

واش روم سے واپسی پر میں تاج والی کے پاس رک گیا۔ اس کے بائیں طرف ونڈو

سیٹ بھی خالی تھی اور دائیں طرف کی اکیلی سیٹ بھی۔ اکیلی سیٹ پر بس اس کا ہنڈ بیگ رکھا تھا۔ وہ اپنے سرخ قلم سے اپنی کتاب میں کچھ سطروں کو نشان زد کر رہی تھی؛ میں ٹھہرا رہا۔ وہ محوِ مطالعہ رہی۔ وہاں سے وقت کے کئی دقیقے گزر گئے، لیکن میں ٹھہرا رہا۔ بالآخر اس نے اس سیٹ سے اپنا بیگ اٹھایا اور بائیں طرف والی پر رکھ دیا۔ میں بیٹھ گیا اور ایک مرتبہ پھر اپنے اصول کے مطابق پیار کے اس شہر کی فصیل کے بھی باہر ہی پڑاؤ ڈال لیا؛ کوئی بات نہ کی۔ اس کے سامنے سکرین پر وہ نقشہ چل رہا تھا جس پر ہمارے جہاز کی سمت دکھائی دے رہی تھی۔ ہم اٹلانٹک پار کر چکے تھے۔ ساحل سمندر سے لے کر برلن تک اس نے کوئی بات نہ کی۔ جوں ہی جہاز کی نوک برلن کے نکتے پر آئی، اس نے میری طرف دیکھا۔

''آپ کے بچپن کی دوست کو پڑھائی کا شوق تھا؟''

تاج والی لڑکی نے گویا قسم کھائی تھی کہ میری شادی منزہ سے کرائے گی۔

''جی بہت''۔ میں نے خوش ہو کے کہا۔ جو بھی ہو کچھ دیر کی 'کُٹی' تو ختم ہوئی۔

''وہ ہر وقت کہانیاں پڑھتی رہتی تھی؛ مجھے بھی سناتی تھی۔ حقیقی زندگی کو بھی کہانی سمجھنے لگی تھی۔ خیر میں آپ سے معذرت کرنا چاہ رہا تھا......''

''آپ نہیں سمجھتے کہ یہ زندگی ایک کہانی ہی ہے۔ ایک ایسی کہانی جس کے لیکھ ہم کھد، ہم خود ہوتے ہیں؟'' اس نے میری بات کاٹ کر مجھ پر اپنا فلسفہ جھاڑا۔ مگر میرا دھیان اس کے الفاظ اور تلفظ کی طرف گیا۔

''اس ہندوستانی فیملی نے آپ کی زبان پہ دم کر چھوڑا ہے۔ اپنے تلفظ، اپنے لفظوں سے۔''

''جی انہوں نے مجھے بہت کچھ دیا ہے۔'' اس نے میرے منفی کو مثبت کرتے ہوئے کہا۔

''مثلاً کیا دیا؟ آپ کے کام کی اجرت؟''

''کام تو مَیں وہاں اپنا وقت گزارنے کے لیے کرتی تھی، اُجرت کے لیے نہیں۔ لیکن انہوں نے مجھے وہ اپنا پن دیا جس کی وجہ سے میں وہاں تین ماہ زندہ رہ سکی۔ میں اگر باقی کی ساری زندگی بھی

ان کی دیٹرس بن کے رہوں ناں تو 'آئی' کی اُس محبت کا قرض نہ چکا پاؤں جو انہوں نے ہر روز میری چٹیا بنا کر مجھے دی۔ شنکر انکل مجھے بیٹی کہتے تھے۔ ہر روز مجھے اپنی گاڑی میں سکول چھوڑتے بھی تھے اور واپس بھی لے آتے۔ ہر وقت کہتے مُون میری تیسری بیٹی ہے۔۔۔ یہ سب کرنا آسان ہوتا ہے کیا؟''

معلوم نہیں لوگ کیسے دشمنوں کے بیچ رہ لیتے ہیں، میں نے سوچا اور فضول کی باتوں کو چھوڑ کر اسے اصل مدعے کی طرف لے آیا:

''میں معذرت چاہتا ہوں میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ خدانخواستہ آپ کسی سے کم ہیں اس لیے آپ کو منزہ کے نہ ملنے پر دوسرے آپشن کے طور پہ لیا جائے۔ دراصل میں ایک سچ بولنا چاہ رہا تھا۔''

''کیسا سچ؟'' اس نے چہرہ دائیں گھما کر میری طرف دیکھا۔

''یہی کہ اب میری تلاش کا رخ میری اصل کی طرف ہوگا۔ میں اس مٹی کی طرف لوٹ جاؤں گا جہاں سے میری محبتوں کا خمیر اٹھا تھا۔ آپ کیا کہتی ہیں؟ چلیں میں آپ سے پوچھتا ہوں۔''

وہ کنفیوز دکھائی دی۔ جیسے اسے بالکل سمجھ نہ آ رہا ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ اسی اثنا میں میری نظر اس کے ہاتھوں میں موجود کتاب پر پڑی۔ ذرا غور سے دیکھا تو ڈائری تھی۔

''یہ آپ کی ذاتی ڈائری ہے؟'' میں نے ایک اور فضول سوال اپنے اکاؤنٹ میں ڈال لیا۔

''نہیں جی، یہ ڈائری نہیں ہے۔ دراصل میں ایک ناول لکھ رہی ہوں، اس نوٹ بک میں اس کے کچھ نوٹس ہیں، وہی دیکھ رہی تھی۔''

''واہ، بھئی!!'' میں نے اسے ستائش سے دیکھا۔ ''آپ تو چھپی رستم ہیں۔ مجھے پڑھنے دیں گی؟''

میری توقع کے خلاف اس نے اپنی نوٹ بک میری گود میں رکھ دی، جب کہ وہ سرخ رنگ کا قلم جو اس کے ہاتھ میں تھا اسے بند کر کے سامنے والی پاؤچ میں اٹکا دیا۔

''اب آپ اپنی سیٹ پر جائیے، مجھے سونا ہے۔'' اس نے ملتجی لہجے میں کہا اور میں اس کے ناول کے نوٹس والی کاپی لے کر آگے والی سیٹ پر آ بیٹھا اور بیچ بیچ میں سے پڑھنے لگا۔

میری نظر جس پر سب سے پہلے پڑی اس پیراگراف کا عنوان تھا "یقین" اور اس کا مضمون کچھ یوں تھا:

"مجھے یقین ہے کہ میری رگوں میں جو ایک خون سا دوڑتا ہے ناں، یہ میرے دل میں لگے ان گلابوں کا عرق ہے جنھیں میں تمھاری یادوں کے بیج بو کر اگاتی ہوں۔ کبھی کبھی جب بادل ٹوٹ کر برستے ہیں تو مجھے لگتا ہے کہ کسی کے ہجر میں ان سے صبر کا دامن چھوٹ چلا ہے؛ محبت کے ان بیماروں کی دعائیں لینے میں گھر کے صحن میں نکل آتی ہوں اور اپنا پلو پھیلا لیتی ہوں۔ پاگلوں کی طرح قوسِ قزح مانگتی ہوں۔ گھوم گھوم کر آسمان کو دیکھتی ہوں۔ بالآخر میری بھیگی آنکھیں اک ست رنگی پینگ بنا ڈالتی ہیں۔ میں باری باری ہر رنگ کو دل میں بھر لیتی ہوں۔ محبت میرے سینے سے کھل کر، عرقِ گلاب میں مل کر جسم کے رُوئیں رُوئیں میں مچلنے لگتی ہے۔ جی رقص کرنے پہ مائل ہونے لگتا ہے۔ لگتا ہے ابھی دیوانی ہو جاؤں گی۔ پھر میں جھرجھری سی لے کر اپنے وجود کو اپنی ہی بانہوں میں بھرتی ہوں، تجھے پیار کرتی ہوں، تجھے پیار کرتی ہوں......"

اقرارِ دیوانگی کا یہ مضمون کوئی وفا دان ہی لکھ سکتا تھا۔ لفظ کے پہلو میں لفظ بٹھا کر محفلِ ادب سجانا کسی گناہ گارِ محبت کے بس کی بات نہ تھی۔

میں نے پیچھے مڑ کر تحسین آمیز نظروں سے دیکھا مگر وہ تکیے کو سینے سے لگا کر سو رہی تھی۔ سیاہ زلفوں کی ایک جھانجھر اس کے چہرے کا گھونگٹ بنی ہوئی تھی۔

ایک اور باب کا عنوان تھا، "دعا"

"کائناتِ محبت کے پالن ہار! تُو جانتا ہے ناں کہ میرے گوشوارۂ ملکیت میں متاعِ محبت کے سوا کچھ بھی نہیں؟ اور تُو یہ بھی جانتا ہے کہ میں خوش بوؤں اور تتلیوں کے قافلے میں شامل ہو کر وادیِ عشق کے سفر پر چل پڑی ہوں۔ اے میرے علیم و خبیر، کچھ رہزن میرے خوابوں کی گٹھڑی لُوٹ لینے کی نیت سے گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ اے میرے ہجر کے فیصلہ ساز! نظرِ ثانی کر!! تیرے خزینۂ محبت سے جو ایک چونگھ میں بھر کے لائی تھی، اسے میرا نصیب کر دے۔ اسے

میرا نصیب کر دے۔"

زیرِ لب میں نے آمین کہا اور پھر صفحے پلٹنے لگا۔ ایک صفحے پر لکھا تھا: "بنامِ محبت"۔ خط کا مضمون کچھ یوں تھا:

"میرے خوابوں کی شہ بالی، میری محفل کی ہم جولی، میری تنہائی کی رونق! جب سے ہوش میری آنکھ میں کاجل بن کے اترا ہے ناں، میں نے تجھے اپنی رگ و جان میں رچے بسے پایا۔ میرے اندر بھی تو ہے، باہر بھی تو، میرے دل میں گوشہ نشین بھی تو اور میرے وجود کا حصار بھی تو۔ رُومان کی بھی دیویوں کی تم دیوی، لیلیٰ کی شیرینی میں، ہیر کی چُوری میں، سسی کی مہندی میں، سوہنی کے گھڑولے میں، تمھارے سب روپ امر ہیں۔ تم امر، تمھارا ہجر امر۔

مگر یہ کیا ہے کہ جوں جوں میرا محبوب فاصلے بھرتا جا رہا ہے تمھارا رچاؤ میرے اندر میرے باہر کی نسبت زیادہ تیکھا ہو رہا ہے۔ میری صدا بن کر اس کے خوابوں میں اترنے کے بجائے، تم میری آہ بن کر میری سانسوں کو محال کیے جاتی ہو۔ مجھے آبلہ پا شہرِ بھنبور سے لے کر کیچ مکران تک دوڑانا کیوں پھر سے تمھاری رسم ٹھہری ہے؟ محبت، اری محبت! ان سانسوں کو سانس سانس پر آہوں سے بچانا اب دشوار ہوا جاتا ہے، میں تھک چکی ہوں، مجھے سہارا دو۔ میرے سیلِ رواں کو کوئی تو کنارہ دو۔ وہ میری منزل کو اس تیزی سے دور لے کے جا رہا ہے کہ میں سارا جیون بھی بھاگوں تو اس تک نہ پہنچ پاؤں۔ مجھے پنکھ عطا کر دو! محبت، میری محبت! تجھے خدائے یوسف کا واسطہ اس کی آنکھ میں بھی اتر و میری تصویر بن کر۔ اس کی زبان سے بھی ادا ہو میرا نام بن کر...... جادو کر، منتر پڑھ، سحر ڈال، کچھ تو کر کہ وہ پلٹ آئے، وہ پلٹ آئے......"

بہ ظاہر یہ سارے الفاظ ایبسٹریکٹ تھے۔ محبت پر ایک خوب صورت تحریر سے زیادہ کچھ بھی نہ تھے۔ لیکن مَیں جو محبت کی بازی ہار کے آ رہا تھا انھیں دل پہ لینے لگا۔ میری آنکھیں نم ہونے لگیں۔ شاید یہ میری کیفیت سے زیادہ غمِ محبت کا وہ سماں تھا جو تاج والی لڑکی نے اپنی تحریر سے باندھا تھا یا شاید یہ احساس کہ محبت کی اصلی جنس تو تھی ہی وہیں، میں جہاں سے نکلا تھا۔ خیر جو بھی تھا

ربِ لامکاں کا صد شکر ہے کہ اس نے ہمیں توفیق دی کہ ہم اردو ادب کی کتب کو سافٹ میں تبدیل کر سکے۔ اسی صورت میں یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ مزید اس طرح کی عمدہ کتب حاصل کرنے کے لئے ہمارے گروپ میں شمولیت اختیار کریں۔

انتظامیہ برقی کتب

گروپ میں شمولیت کے لئے:

عبداللہ عتیق: 8848884 347 -92+

محمد ذوالقرنین حیدر: 3123050300-92+

اسکالر سدرہ طاہر صاحبہ: 0120123 334 -92+

میں نے ہاتھ کی پُشت سے اپنی آنکھوں کو صاف کیا اور کاپی کا صفحہ پلٹا۔ اگلے صفحے پر لکھا تھا:

''بنامِ محبت!''

عین اسی وقت ایک ہاتھ نے اس صفحے کو ڈھانپ دیا۔ صندل سا، سُندر سا ہاتھ۔ میری طرف سے چوتھی انگلی میں سونے کی ایک بہت ہی نفیس انگوٹھی تھی۔ مجھے نہیں معلوم وہ پچھلی سیٹ سے اٹھ کر کب میرے پہلو میں آ بیٹھی تھی اور کب کی وہاں بیٹھی دمِ مطالعہ میرا چہرہ پڑھ رہی تھی۔

''بس کریں لائٹ کم ہے۔ آنکھوں پر دباؤ پڑے گا۔'' اس نے ڈائری میری گود سے اٹھائی، اور مجھے دیتے ہوئے کہا: ''تسلی سے گھر پہنچ کر پڑھیے گا اور مجھے اپنا فیڈ بیک دیجیے گا۔'' اس کے لہجے میں وہ تاثیر تھی کہ وقت کے اس مقام پر مطالعہ تو کیا وہ سانس بند کرنے کو بھی کہتی تو بخدا میں انکار نہ کرتا۔ ویسے بھی کوئی کم بخت ہی ہوگا جو مصنف کے پہلو میں ہونے کے باوجود تصنیف سے چپکا رہے۔ میں نے ڈائری سامنے لگے پاؤچ میں ڈالی اور دھیمے سے لہجے میں کہا:

''آپ بہت اچھا لکھتی ہیں۔''

''جی، شکریہ۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

اس کے سامنے لفظوں کی تابع داری کو دیکھ کر یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ وہ بھی فقیرِ محبت تھی۔ اس کا تعلق بھی جنونِ مجنوں سے تھا۔ وہ بھی قیس کے قبیلے کی ملوک زادی تھی۔ دل والوں کے قافلے کی مسافرہ تھی۔ وہ بھی وادیِ خواب کا پاسپورٹ رکھتی تھی۔

--☆--

﴿۲۱﴾

میرے آگے والی سیٹ پر بیٹھے پہاڑ قامت انکل جو سارا راستہ ہی اپنے آگے والی سیٹ سے وِلہڑ کر سوتے آئے تھے، اب خبر نہیں کیا سوچ کر لمبے ہونے کی ٹھان چکے تھے۔ اسی ارادے سے انھوں نے اپنی سیٹ پیچھے کی طرف یوں پھیلائی کہ وہ میری گود میں آ رہی۔ میں جو دنیائے محبت کا موقع پرست ہوں، اسی سیٹ پر اپنی پیشانی کے بائیں کونے کو ٹکا کر ایک دل آویز زاویے سے تاج والی لڑکی کو دیکھنے لگا۔ وہ لجائی تو میں نے پوچھا:

''مزہ آتا ہے، ناں؟''

''جی، بہت۔''

جیسے مجھے اس کا سوال یاد تھا، ویسے اسے بھی شاید میرا جواب یاد تھا۔ مگر اس سے پہلے کہ میں اسے کہہ پاتا کہ وہ دنیا کی خوش قسمت ترین انسان تھی، وہ کہنے لگی:

''جانتے ہیں یہ مزہ کیوں آتا ہے؟'' ظاہر ہے میں جانتا تھا۔ مجھ سے بہتر کون جان سکتا تھا۔ مگر مجھے اس سے سننا تھا، سو خاموش رہا۔

''محبت ایک میٹھا درد ہے......'' اس نے اپنے آگے والی سیٹ کے پیچھے لگی میل ٹرے پر سر ٹیک کر آہستہ آہستہ بولنا شروع کیا۔ ''ہمیں یہ درد اک رنجیدہ سی خوشی دیتا ہے...... اس سے اک بے قرار سا سکون آتا ہے...... جان لیوا سا سرور ملتا ہے...... جان لیوا سا سرور ملتا ہے......''

ہر دو جملوں کے بیچ والے وقفے میں اس نے جو شیریں خاموشی بولی، مجھے قدرت ہوتو اس خاموشی پر محبت کے سبھی گیت سنگیت وار دوں۔

اب اس کی آنکھوں پر پلکوں کا پردہ گر چکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ پردے کی اوٹ میں دیے روشن کر دیے گئے ہیں۔ اگربتیاں جلا دی گئی ہیں۔ محفل سج چکی ہے۔ محبوب کی زیارت جاری ہے سو میں مخل نہ ہوا، انتظار کیا۔ اس کے چہرے کی زردی میں لالی کو اترتے دیکھا۔ ہونٹوں کو میٹھا درد چکھتے دیکھا۔ رنجیدہ خوشی پھیل رہی تھی۔ تاج والی لڑکی سکونِ بے قرار میں تھی۔ سرورِ جاں سوز میں۔ کئی مقاماتِ وقت آئے اور گزر گئے۔ کافی دیر کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور مجھے تلاوتِ رُو میں مبتلا پا کر جھنجھلائی...... مگر خاموش رہی۔

"لگتا ہے وفا نہیں کی اس نے آپ سے..........." اس جہاز میں معلوم نہیں کیا ہو گیا تھا مجھے کہ میں بار بار بے تکی باتیں کیے جا رہا تھا۔ بجا طور پر اسے غصہ آیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر اک بجلی سی کوندی، اک آگ سی لپکی۔ محبوب کی برائی بھلا کون سہتا ہے۔ کون چاہتا ہے کہ اس کی زندگی کے معانی پر کوئی ایرا غیرا سوال اٹھائے۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے، جناب۔" اس نے بس اتنا کہا۔

"تو پھر کیا بات ہے؟ آپ کی آنکھوں پہ تو ہجر کے پہرے ہیں؟"

میں اپنی سبھی حدیں پار کر رہا تھا۔ وہ میرے کسی بھی سوال پر ری ایکٹ کر سکتی تھی۔ مگر میں جو محبت کا کھوجی تھا، اس کی پیازی پرتوں کو پلٹنا میری کمزوری تھی۔ محبت کی مشرقی تعبیر سے تعارف ہو ہی گیا تو کیوں کر رک سکتا تھا؟

میرے سوال پر ایک لمحے کے غور کے بعد وہ کھلکھلا کر ہنس دی اور ہنستے ہنستے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ پھر دائیں ہاتھ کی پیالی بنا کر، اس میں اپنی نازک ٹھوڑی سجا کر، میری آنکھوں میں دیکھ کے کہنے لگی:

"لگتا ہے آپ بھی محبت پر کچھ لکھ رہے ہیں۔ کوئی مضمون وغیرہ۔ اگر ایسا ہے تو بتائیں تاکہ میں آپ کی مدد کر سکوں۔ آدھے مسافروں سے آپ انٹرویو کر لیں آدھوں سے میں کر لیتی ہوں۔ زبردست مضمون بنے گا......"

اس بار اس نے ہر جملے کو مُسکراہٹ میں لپیٹ لپیٹ کر بولا۔

"نہیں، میں مضمون تو کوئی نہیں لکھ رہا مگر محبت ہے میری دل چسپی کا موضوع...... ویسے ان چار پانچ سو مسافروں میں، شاید ہی کوئی ہو جو حقیقتِ ہستی کو سمجھا ہو۔ اس دنیا کے اکثر لوگوں کو اوسط درجے سے آگے کی بیداری نصیب ہی نہیں ہوتی۔ اگر ان میں یہ صلاحیت ہوتی بھی ہے تو سماج کے ٹھیکے دار اِن پر نشہ آور عطر چھڑک دیتے ہیں، نیند کے تنبو تان دیتے ہیں تاکہ سوچ بیدار نہ ہونے پائے، فکر ارتقا نہ کرے، زندگی ہوشیار نہ ہو جائے۔ کہیں اگر کوئی ہوشیار خبر دار ہو بھی جائے تو یہ سماج دار اسے ہوشیاری کی اتنی لت ڈال دیتے ہیں کہ زندگی بھر پڑیں کر کر کے مر جاتا ہے۔ یوں سماج کئی ایک بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے۔ محبت ان سب سے بڑی ہے مگر آپ کی بات اور ہے۔ آپ کی ڈائری کے حرف حرف سے محبت کی خوش بو آ رہی ہے......"

"ارے واہ......" اس نے تالی بجا کر کہا، "میرے نوٹس پڑھ کر تو آپ کی بھی اردو اچھی ہو رہی ہے۔"

جواباً میں محض مسکرا دیا کیوں کہ ظاہر ہے میری اردو اچھی تھی اور پہلے کی اچھی تھی۔

"میری شادی پر آئیں گے؟" اس نے اپنی انگوٹھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی اگر آپ بلائیں گی تو ضرور آؤں گا۔"

"میں بلاؤں گی، بہت جلد۔"

"وعدہ۔ میں بھی آؤں گا۔" میں نے اپنا ہاتھ اس سے ملانے کے لیے آگے کیا، مگر اس نے اسے نظر انداز کیا اور اپنا کمبل اوڑھنے لگی۔

جیسے کہہ رہی ہو رہنے دو ان وعدوں کو۔

مشرق کے اپنے رنگ ہیں اور ان رنگوں کی اپنی جاذبیت ہے۔ میں جو ازل سے

فقیرِ محبت تھا، اپنے ہاتھ کو یوں خالی لوٹتے دیکھ کر مسکرا دیا۔ میرے سامنے والی سیٹ پر دراز انکل اب نیند کے اس موڑ پر آ پہنچے تھے جہاں خراٹے جہاز کے انجنوں سے مقابلے پر اتر آتے ہیں۔ ہم ان سے زچ تو ہو رہے تھے مگر پھر بھی بات جاری رکھی لیکن پھر ان کی نینداور ہماری زندگیوں میں ایک اور موڑ آیا جس نے ہماری گفت گو کی کایا ہی پلٹ دی۔

ہُوا یوں کہ انکل کے خراٹے اپنی بلند ترین سطح پر پہنچ کر ایک ردھم میں آ گئے۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ یہ دھن کوئی سنی سنائی سی لگتی ہے کہ ان کے نتھنے لفظ خراٹنے لگے۔ ''گو نواز...... گو۔'' ''گونوااااااااز............ گو'' ''گونواااااااز ...... گو۔'' تاج والی لڑکی نے میری طرف دیکھا، میں نے اس کی طرف۔ وہ لڑکی تھی، احتیاط اس کی سرشت میں تھی، سو اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی کو روک لیا۔ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے ایک جہاز شگاف قسم کا قہقہہ دے مارا۔ انکل نے کروٹ بدلی، ادھ کھلی آنکھوں سے پیچھے دیکھا اور چنگھاڑ کر کہا: ''اوئے......'' میں نے جلدی جلدی وہ دعا کی جو میرے گاؤں کے لوگ کسی آفت کو سامنے دیکھ کر پڑھا کرتے تھے: جل توں جلال توں، آئی بلا ٹال توں۔ ''اوئے، شیدے! تیری .... کی............ (تادمِ تحریر، ناقابلِ تحریر)۔ آج اتر اسٹیج سے میں تیری .... کی............ سے............ کر کے............ کی............ کی............ سے............ کرتا ہوں۔'' جوں ہی میری سمجھ میں آیا کہ انکل اب بھی نیند میں ہیں لہٰذا خطرے کی کوئی بات نہیں، میں نے دائیں مڑ کر تاج والی لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس نے فوراً اپنا چہرہ تکیے سے چھپا لیا اور اٹھ کر پچھلی سیٹ پر جا بیٹھی...... اور میں دل میں انکل کو کوسنے لگا کہ خدا آپ کو خوار کرے گالی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ لفظ سے جو بھی واہیات عمل کرنا ہے، وہی بتا کے تسلی کر لو، جگہیں گنوا کر انسانی حیاتیات کا علم بتانے کی کیا ضرورت ہے۔

خیر ان کے مغلظات سے میں نے تاج والی لڑکی کے چہرے پر شرم و حیا کی چادر آتے دیکھی اور ایک بار پھر انکل کو کوس کر سوچا کہ انکل آپ صرف خراٹوں کے ہی نہیں قسمت کے بھی دھنی

ہیں۔ تاج والی کی جگہ اگر آج یہاں اینا ہوتی ناں تو آپ ابھی سیاست دانوں کی ماں بہن ایک کرنے سے فارغ نہ ہوئے ہوتے کہ وہ اپنی فحش ترین گالیوں سے آپ کی توند سجا دیتی۔

--☆--

جہاز ابھی ابوظہبی سے دو گھنٹے کے فاصلے پر تھا۔ میرے خیال کے براق نے پرواز بھری اور پلک جھپکتے میں مجھے میرے گاؤں پہنچا دیا۔ پہلے میں نے بشکو نائی کی دیوانگی کو تصویر کیا۔ پھر رمضی کی شرارتوں پہ مسکرایا۔ مولوی امان اللہ کی خود غرضی پہ کسمسایا۔ تایا جان کے غصے پہ غصہ آیا۔ ابو جی کے پسندیدہ گھوڑے اور محبت کرنے والے کونجوں کے جوڑے کو سوچا۔ امی جی کا پیار یاد آیا۔ منزہ کے دادا کا کھسہ، اس کی امی کے ہاتھ کی پکی چیزوں کا ذائقہ۔۔۔ اور پھر مجھے ماسٹر جی یاد آئے اور ساتھ ہی یاد آیا ان کا سوالِ محبت بھی۔

''محبت کہاں ہے؟'' ماسٹر جی سکول کے گراؤنڈ میں کھڑے مسکرا رہے تھے۔

''کیوں سلیم میاں، کہاں ہے محبت؟'' وہ خراٹا انکل کی سیٹ کی پشت پر لگی سکرین پر نمودار ہوئے۔

میں نے خیال جھٹکا اور کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔

''نہیں ڈھونڈ پائے ناں ابھی تک؟'' ماسٹر جی جہاز کے نیچے تیرتے بادلوں پر سوار تھے۔ میں گھبرا گیا۔ میرے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ ایک آہ بھر کر اوپر دیکھا۔

''کہاں ہے؟'' انھوں نے جہاز کی چھت سے جھانک کر دیکھا۔

فرار ناممکن تھا سو میں نے ان کے سوال کا سامنا کرنے کی ٹھانی۔

''چھوڑیے، ماسٹر جی۔ یہ بھی کوئی سوال ہے۔ کہاں نہیں ہے، محبت؟''

''ہمیں بھی تو پتا چلے......؟''

''اچھا تو پھر سنیے ماسٹر جی! محبت ہمارے اردگرد ہر طرف ہے۔ نیچے سمندروں کے پانیوں نے جو نیلا رنگ اوڑھا ہوا ہے ناں وہ محبت کا ہے۔ ان بدلیوں کی اٹکھیلیوں میں، صبا کی خنکی میں، گلوں کی

خُوش بو میں، ماں کی لوری میں، باپ کی دوڑ دھوپ میں، خزاں کی فصلوں میں، میمنوں کی مستی میں، ساری ہستی میں...... کیا کیا گنواؤں، ماسٹر جی۔ چہار سُو محبت ہی تو ہے!!"

"ناں، ناں" ماسٹر جی قائل نہ ہوئے۔ "سلیم میاں آج بھی محبت کا پتا معلوم نہیں ہے آپ کو۔ ہاں آپ بڑے ہو گئے ناں، ادب ودب پڑھ لیا تو باتیں واتیں بنانا آ گیا، بس۔"

"ماسٹر جی!" میں نے انہیں آنکھ مارتے ہوئے کہا تو انہوں نے بھنوؤں کے اشارے سے پوچھا 'کدھر؟'

"ادھر۔" میں نے انگوٹھے سے پچھلی سیٹ کی طرف اشارا کیا جہاں تاج والی لیٹی تھی۔

"ارے، کدھر بھائی؟"

"محبت میرے پیچھے ہی تو ہے، ماسٹر جی۔" اب جو میں نے پلٹ کر دیکھا تو ماسٹر جی وہاں سے غائب تھے۔

--☆--

﴿۲۲﴾

میں نے ابوظہبی ایئر پورٹ پر اسلام آباد کی فلائٹ کا شیڈول دیکھا۔ جہاز نے اپنے وقت پر نکلنا تھا۔ سو میں نے تاج والی لڑکی سے کہا: "ہمارے پاس تین گھنٹے ہیں۔ آئیں پہلے فریش ہو لیتے ہیں۔ پھر کچھ ڈیوٹی فری شاپنگ کریں گے اور کافی وغیرہ پئیں گے۔"

"تین گھنٹے آپ کی فلائٹ میں ہیں، جناب۔ میری میں صرف ایک گھنٹہ ہے۔" اس نے اپنا سامان اٹھایا اور ایک طرف جاتے ہوئے کہا: "مجھے چیک ان کرنے کے لیے فوراً جانا ہوگا۔"

"تو آپ نے کراچی جانا ہے؟" میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"نو، ملتان"۔ مجھے اپنا سرائیکی اظہاریہ 'دھاڑ وئے' یاد آیا جو میں نے جہاز میں اپنے پہلو میں اسے دیکھ کر بولا تھا کہ اسے سمجھ نہیں آئے گی۔

"مگر آپ کریں ڈیوٹی فری شاپنگ اور اپنی اُس بچپن کی دوست، کیا نام تھا اس کا......؟"

"منزہ۔"

"ہاں منزہ...... منزہ کے لیے کوئی انگوٹھی شنگوٹھی لے جایئے گا۔ وہ اُس طرف ڈائمنڈ رنگز کا ایک بڑا اچھا سٹال ہے۔" اس نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔ اچھا ٹھیک ہے۔ بہت اچھا لگا آپ کے ساتھ سفر کر کے۔ آئندہ بھی کریں گے۔ آیئے

گا۔اچھا؟'' گذشتہ پچیس گھنٹوں میں ایک پل بھی نہ سونے کی وجہ سے اب میرا دماغ مجھے بلبلیاں مروار ہا تھا۔

''فون استعمال کرتے ہیں آپ؟'' اس نے یوں بے پروائی سے پوچھا جیسے خاموشی کو پُر کر رہی ہو۔

''جی کرتا ہوں۔'' میرا دماغ اب بھی سُن تھا۔

''نمبر دیں گے اپنا؟ وہ آپ کو شادی پر بلانا ہے ناں؟''

''او، ہاں......'' میں نے اسے اپنا امریکہ والا نمبر دیا جس پر انٹرنیشنل رومنگ آن تھی۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہم اس کے بورڈنگ ایریا کے پاس پہنچ گئے تھے۔ نمبر نوٹ کرتے ہی اس نے مجھے خدا حافظ کہا اور چل دی۔ میں نے بھی اپنا سامان اٹھایا اور پلٹ آیا۔ کافی دیر سیدھا چلنے کے بعد لاشعوری طور پر میں نے اس طرف مڑ کر دیکھا جہاں اسے الوداع کہا تھا۔

وہ وہیں کھڑی تھی۔

جوں ہی مجھے پلٹتے دیکھا اس نے جلدی سے ہاتھ ہلایا اور بورڈنگ ایریا میں داخل ہوگئی۔ عجیب لڑکی ہے۔ اتنی دیر سے وہیں کھڑی تھی۔

--☆--

کافی وقت مَیں ابوظہبی ایئر پورٹ پر گھومتا رہا۔ ریسٹ روم میں جا کر منہ ہاتھ دھویا، برش کیا، اسٹالز پر جا کر کچھ چھوٹی چھوٹی چیزیں لیں۔ ہیرے کی ایک سٹینڈرڈ سائز انگوٹھی خریدی۔ اسٹاربکس سے کافی لی اور چیک اِن کر کے ویٹنگ ایریا میں جا بیٹھا۔ وہاں پہنچ کر مجھے خیال آیا کہ میرے گھر والے متفکر ہوں گے۔ مجھے انھیں اطلاع دینی چاہیے کہ میں خیریت سے ابوظہبی ایئرپورٹ پہنچ چکا ہوں۔ سو موبائل نکال کر اسے آن کیا۔ سب سے پہلے میسج کی بیپ بجی۔

سوچا پہلے اسے دیکھ لوں۔

''اِدھر دیکھیں میں نے ٹاٹا کرنا ہے۔''

''مڑیں ناں!''

''سلیم، ادھر دیکھیں ناں۔''

"Nice meeting you, Saleem."

کون تھی یہ تاج والی لڑکی!

"Oh. Sorry for keeping you waiting. My cell was off."

میں نے اس کے پہلے والے تین پیغامات کا جواب بروقت مڑ کر نہ دیکھ سکنے پر معذرت کی اور ساتھ ہی یہ پیغام بھی بھیج دیا:

"Nice meeting you too."

پھر میں گھر والوں کو کال ملانے ہی لگا تھا کہ بیپ اوپر نیچے تین بار پھر بجی۔

"No issues."

"And I am saying this again: if you really wanna see what love is, do attend my wedding!"

"And do invite me to your wedding. Khas tor per agar aap ki shadi apni bachban ki dost se ho. Yad hai na mae muhabbat pe novel likh rahi hoon?"

اس کا مطلب ہے۔ ملتان کے جہاز کی روانگی میں کچھ تاخیر ہوگئی تھی۔ اس کے ان پیغامات میں اس قدر اپنا پن تھا کہ مجھے خود پر غصہ آنے لگا ایک شخص کے ساتھ تیرہ، چودہ گھنٹے کا طویل سفر کیا۔ دنیا جہان کی ہر ہوائی بات کی، لغو سے لغو سوال کیے، پر اس سے اس کا نام پوچھنے کی توفیق نہ ہوئی۔ اب اگر کبھی شادی ہوتی بھی ہے تو کیا اس کے کارڈ کے اوپر 'تاج والی لڑکی' لکھوں گا؟ یا اس کا نک نیم 'مون' لکھ کر بھیجوں گا؟ اس سے پہلے کہ میں نام پوچھنے کی خفت اٹھاتا، بیپ پھر بجی:

''آپ بھی کہیں گے یہ منزہ عجیب لڑکی ہے۔ پیچھے ہی پڑ گئی ہے۔ لیکن پھر بھی بلا لینا، پلیز، پلیز۔''

اوہ، تو یہ بھی منزہ ہے۔ اسی لیے تو۔ شاید اس دنیا کی ساری منزائیں ایک جیسی sweet ہیں۔

"Sure, Sure. I would love to have you there. I am sure my Munaza would love to see her namesake."

میں نے یہ پیغام بھیج کر ایک سُستی کُش قسم کی انگڑائی لی جس کے اختتام پر ایک انتہائی بے ہودہ قسم کی جمائی بھی لی جس کے 'آں، ہاں' پر ارد گرد بیٹھے لوگوں نے مجھے گھور کے دیکھا۔ مگر میں ریلیکس ہو چکا تھا۔

پھر میں نے گھر والوں سے بات کی۔ کئی بار موبائل کو دیکھا مگر میرے آخری پیغام کا جواب نہ آیا۔ ظاہر ہے کہ اسے اپنی آغوش میں لے کر جہاز روانہ ہو چکا تھا۔

'سفر بخیر!' میں نے محبت کی معنی آفرینی کرنے والی کے سفینے کو دعا دی۔

--☆--

شاید کسی کی دعا میرے سفینے کو بھی تھی۔ جو پلک جھپکتے میں مجھے میری اپنی فضاؤں کی گود میں لے آیا۔ میرا جہاز اسلام آباد کی فضا میں داخل ہوا تو میں نے تڑپ کر کھڑکی سے باہر دیکھنا چاہا۔ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے صاحب جو آلتی پالتی مار کر ونڈو سیٹ پر براجمان تھے اور جن کی جرابوں کی بُو میں نے پورا راستہ برداشت کی تھی، کسمسائے اور پھر بہت ہی کرخت لہجے میں کہا:

''او بھائی' اُتاں تے نہ چڑھ میرے......'' فوراً مجھے یقین ہو گیا کہ میں پاکستان پہنچ گیا ہوں اور پاکستان میں رہنے کے اپنے تقاضے ہیں۔ لہٰذا میں نے ان صاحب کو اتنی دیر گھور کر دیکھا کہ ان کی موچھیں ڈھیلی پڑ گئیں۔ پھر میں نے آگے بڑھ کر ونڈو کا ربڑی پردہ ہٹایا اور باہر جھانکنے لگا۔

کیا ہم واقعی اسلام آباد میں اتر رہے ہیں؟ اگر ان صاحب نے بدتمیزی نہ کی ہوتی تو میں یہ سوال ان سے پوچھتا۔ اسلام آباد جو کبھی سرسبز و شاداب ہوا کرتا تھا، رنڈی کی کھچّی کی طرح ٹنڈ منڈ پڑا تھا۔ چند ہی برس میں اس کے گرین بیلٹوں میں سے درخت مکمل طور پر غائب ہو گئے تھے۔

--☆--

ایئرپورٹ پر کوئی بیس لوگ میرے استقبال کو موجود تھے۔ کچھ لوگ گاؤں سے بھی آئے ہوئے تھے۔ سب نے باری باری یوں جکڑ کے جپھیاں ڈالیں کہ میرا مساج ہو گیا۔ سفر اور اُس جستجو کی تھکان جاتی رہی جو میں تین سال سے کر رہا تھا۔ ٹرمینل سے باہر گاڑی میں بیٹھتے ہوئے میں نے تقریباً گھسیٹ کر علی کو اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ راستے میں میں نے گاؤں کی خیریت پوچھی اور دو تین لوگوں کا جلدی جلدی پوچھنے کے بعد منزہ کے دادا کا پوچھا۔

''اسے کیا ہونا؟ ویسا ہی ہتا، ہٹا کٹا بیٹھا ہے۔'' علی نے کرختگی سے کہا۔

''البتہ جب سے انھوں نے دوسری شادی کی ہے اور جب سے اظہر انکل ان سے ناراض ہو کے بچوں کو لے کر ڈی جی خان جا بیٹھے ہیں، ملک صاحب کچھ اداس ضرور ہوتے ہیں۔''

''اچھا، یار وہ ایک منزہ ہوتی تھی اظہر انکل کی بیٹی؟''

''او، سلیم بھائی وہ آپ کو ابھی تک یاد ہے؟''

علی نے، جو آج بھی کسی کسی لفظ پر تو تلا جاتا تھا، ایک انتہائی دیہاتی قسم کا قہقہہ لگا کے کہا۔ پھر میرے دائیں طرف بیٹھی امی جی اور فرنٹ سیٹ پر بیٹھے اپنے بہنوئی کا لحاظ کر کے سنجیدہ ہو گیا۔

''وہ بھی کسی چیز میں ایم اے، شیم اے کر رہی تھی'' امی جی نے آہستہ سے کہا۔

''صالحہ کو صحیح پتا ہو گا۔'' علی کے بہنوئی نے کہا۔

صالحہ علی کی بہن تھی۔ جس نے ڈی جی خان میں بہاؤ الدین زکریا یونی ورسٹی کے گدائی کیمپس سے ایم اے اِسلامیات کیا تھا۔ اس کا نام آتے ہی مجھے ایک راستہ میسر آ گیا۔ سو میں خاموش ہو گیا۔ صالحہ کچھ بھی کرے منزہ سے ضرور ملوائے گی۔ میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ منزہ سے ملاقات ہو سکتی تھی۔ کچھ دیر قبل کی گفت گو سے صاف ظاہر تھا کہ اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ 'میں آ رہا ہوں، منزہ۔ بے فکر ہو جاؤ، میں ہزاروں میل دور سے تمھاری خاطر واپس آ گیا ہوں۔' میں نے سوچا۔

--☆--

﴿۲۳﴾

میرا جیٹ لیگ ایک ڈیڑھ دن میں ہی جیٹ کی سی تیزی سے رخصت ہوگیا۔ ہمارے اسلام آباد والے گھر میں عید کا سا سماں تھا۔ بہت سارے دوست ملنے آئے۔ رشتہ دار آئے۔ کئی ایک نے فون کیے۔ نوکری ڈھونڈنے میں مدد کی پیش کش کی۔ اپنے بیٹوں سے ملوایا جو امریکا کی ہارورڈ یونی ورسٹی میں جا کر پڑھنے کے خواہاں تھے اور مجھ سے داخلے کا تعویذ لینے کی امید سے ماؤں کے ساتھ چلے آئے تھے۔ بیٹیوں سے ملوایا جو ماشاءاللہ سے بہت ہی اچھی کُک تھیں، ادب کی دیوانی تھیں، اور اب ڈائیٹ کا بھی خیال رکھتی تھیں۔

ایک صاحب نے کئی نسلیں پیچھے جا کر اپنی کسی مائی بھاگی نامی عورت کا ہمارے کسی بزرگ کے ساتھ غائبانہ نکاح پڑھوایا اور بیٹھے بٹھائے اپنے آپ کو میرا انکل ثابت کر دیا۔ پھر میرا ارادہ جانے بغیر بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی کے کلیہ زبان وادب کے ڈین کا نمبر ملایا اور ایک طویل تمہیدی قہقہے سے خود کو صحیح سلامت بازیاب کرا کے لانے کے بعد انھیں بتایا کہ ان کا بیٹا (اب تک میں ان کا بیٹا ہو چکا تھا) امریکا کی 'کالو، کالوراڈو' یونی ورسٹی سے ایم۔ اے۔ انگریزی کر کے آیا ہے اور یونی ورسٹی ٹیچنگ میں انٹرسٹڈ ہے اور جب ڈین صاحب حکم فرمائیں اُسے کان سے پکڑ کر ڈین صاحب کے حضور پیش کر دیں گے۔ بس شروع میں کوئی ایک آدھ کلاس بھی مل جائے تو

تجربہ ہو جائے گا۔ بس ڈین صاحب کی شفقت کا سایہ درکار تھا اور بس پھر وہ اُس کی بہت جلدی شادی بھی کرنے والے تھے۔ اب دلہن کو یہ نہ لگے ناں کہ اس کا ہونے والا شوہر نکما نکھٹو ہے۔ یہ جملہ بولتے ہوئے ان 'انکل' نے پہلے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا اور پھر میری طرف۔ پھر ڈین صاحب کو خدا حافظ کہنے سے پہلے بھی ایک قہقہہ لگایا اور فون بند کرتے ہی امی جی سے مخاطب ہوئے:

"بہن، مبارک ہو۔ یہ تو ابھی فون پر بات ہوئی ہے۔ وزیٹنگ کلاس کا کہہ رہا تھا۔ ابھی تو جب وہاں جا کر بات کروں گا تو اس کی ایسی کی تیسی، لیکچرار رکھے گا، پکا۔"

لفظ 'پکا' پر معلوم نہیں کہ ان کی بیٹی کو کیا یاد آ گیا کہ اُس کی ہنسی نکل گئی جسے اس نے فوراً قابو کر لیا اور پھر سے اپنے ناخن کھانے لگی۔ خیر امی جی نے انکل کو 'خیر مبارک' کہا اور شکریہ بھی ادا کیا۔

"نہیں، نہیں بہن شکریے کی کون سی بات ہے۔ سلیم ہمارا اپنا بیٹا ہے۔ سمجھ رہی ہیں ناں آپ، یہ بس میرا بیٹا ہے۔"

اب تک مجھے بیٹے کا مطلب سمجھ آ گیا تھا۔ میں نے اپنی چائے کا مگ میز پر رکھا، صوفے پر ذرا سا آگے ہوا اور کہا: "میں یونی ورسٹی میں نہیں پڑھانا چاہتا، جی۔"

میرے اس درشت لہجے کی انکل کو بالکل توقع نہ تھی۔ ان کا بھاری بھرکم چہرہ ایک جھٹکے سے میری طرف مڑا تو سرخ تھا۔

"میں اپنے گاؤں کے سکول میں پڑھاؤں گا۔ اسی سکول میں جہاں سے میں نے پڑھا ہے اور انکل جی میری شادی کی بھی فکر نہ کریں۔ شادی میں اپنی ایک امریکی دوست سے کروں گا۔ جو بہت جلد پاکستان آئے گی۔۔۔ اور اسے میرا نکما پن بہت اچھا لگتا ہے۔"

یہ کہہ کر میں مسکرایا، صوفے میں پیچھے ہوا اور ٹیک لگائی اور نکموں کی طرح ٹانگ پر ٹانگ رکھ کے بیٹھ گیا۔ انکل نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا اور کہنے لگے: "یہ تو اور بھی اچھا ہے بھئی۔ گاؤں کے بچوں کے لیے۔ اچھا بہن ہم چلتے ہیں۔ چلو بیٹی۔ چلتے ہیں۔" وہ اچانک اٹھے، اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑا اور چل

دیے۔

میں نے امی جی سے اس سے بدتمیزی پر معذرت کی۔ پھر دو چار مذاق کیے مگر وہ اداس ہی رہیں۔

''کیا ہو گیا ہے، امی جی؟'' میں صوفے سے اتر کر ان کے سامنے فرش پر بیٹھ گیا۔

''آپ کو پسند ہے ان انکل کی بیٹی؟'' میں نے دوسرا سوال کیا۔

''نہیں۔''

''پھر کیوں اداس ہیں، آپ؟'' میں نے تڑپ کر کہا۔

''اس گوری کے ساتھ چلے جاؤ گے ناں پھر؟'' میری امی جی جنہوں نے مجھے ہمیشہ آزاد رہنا، اپنے فیصلے خود کرنا سکھایا تھا، میری چند سالوں کی دوری پر ہمت ہار چکی تھیں۔ ذرا غور کیا تو فکر ان کی پیشانی پر لکیریں ڈال چکی تھی۔ میرے پیچھے میری ماں بوڑھی ہو گئی تھی۔

''نہیں نہیں، امی جی۔ میں تو ان انکل کو جھوٹ بول رہا تھا۔ ایسا کوئی چکر نہیں ہے۔ اب شادی میں گاؤں میں کروں گا۔ آپ کی پسند سے۔''

وہ مسکرائیں اور آگے بڑھ کر میرے گال کو چوم لیا۔

اچانک میں شدید قسم کے احساسِ جرم میں مبتلا ہو گیا۔ اگر جینی منع نہ کرتی تو کیا ہوتا؟ اگر یہ سچ ہوتا تو میری ماں کس قدر افسردہ ہوتی۔ میں تو اپنی محبت کے سبھی تہوار بولڈر میں منانا چاہتا تھا۔ میں اپنی محبت دور دیس میں بسانا چاہتا تھا۔ دراصل گلوبلائزیشن اور زمان و مکان کے سمٹنے سے جو کثیر الثقافتی نگر وجود میں آیا تھا، وہ صرف نوجوان نسل کے لیے حقیقت کا روپ دھارے تھا، ہماری بزرگ نسل اس کو بجا طور پر اک سراب سمجھتی تھی۔

''بڑا پیار ہو رہا ہے بھائی، ماں بیٹے میں......''

ہم جب سے اسلام آباد شفٹ ہوئے تھے ابو جی نے تلے دار کھسہ پہننا چھوڑ دیا تھا اور باٹا کے بوٹوں کی قباحت یہ ہے کہ ان سے چیں چیں کی آواز نہیں آتی۔ میں ابھی مسکرا ہی رہا تھا کہ وہ کہنے

لگے: ''تو پھر کب چلیں گاؤں سے تمہاری انارکلی لینے، سلیم صاحب؟''

''جب آپ لوگ کہیں، ابو جی۔''

امی جی ہنستے ہوئے اٹھیں اور چائے کے برتن اٹھا کر کچن میں چلی گئیں۔ ابو جی بھی ''اگلے ہفتے'' کا اعلان کر کے اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔ ڈرائنگ کے قالین پر بیٹھے بیٹھے میں نے مغرب کی طرف رخ کیا اور ہلکے سے کہا:

"Thank you, Jenny."

--☆--

﴿۲۴﴾

میرے ابو کے اٹل فیصلے کے مطابق ایک ہفتہ بعد ہم گاؤں گئے۔ میں کوئی چار سال بعد گاؤں آیا تھا۔ سب کچھ بدل چکا تھا۔ نئے مکان، نئے گھر، نئی گلیاں...... گاؤں مغرب میں پھیل کر انڈس ہائی وے پر آ چڑھا تھا اور مشرق میں بڑھ کر رمظی کے بھانے تک جا پہنچا تھا۔ سائیں بابا کا کیکر تو گویا اب گاؤں کے بیچ میں آ گیا تھا۔ پرانے مکان یا تو بہت ہی بوسیدہ ہو گئے تھے اور یا پھر renovate ہو کے بالکل نئے۔

منزہ کی یادوں کی طرح۔

وہ ندی، جس میں ہم کاغذ کی کشتیاں اتارا کرتے تھے، پختہ کر دی گئی تھی۔ میں نے اپنے گھر کے باہر گاڑی روکی تو کوئی پندرہ بیس بچے ارد گرد جمع ہو گئے۔ ان میں سے اکثر شلوار قمیص میں سے کسی ایک چیز سے محروم تھے۔ یعنی غربت اب میرے گاؤں میں پہلے سے زیادہ خوش حال تھی۔ ایک لمحے کو مجھے وہ نفیس مفلر یاد آیا جو میں نے مردہ ساسا کو لپیٹا تھا۔

--☆--

گاؤں پہنچ کر معلوم ہوا کہ منزہ کی شادی فیض اللہ نامی کسی رشتہ دار سے طے ہو چکی ہے اور یہ کہ فیض اللہ کو ورثے میں بہت رقبہ ملا تھا، جس کی وجہ سے اس کے نشئی اور جواری ہونے کے باوجود

ارد گرد کے کئی گاؤں کی لڑکیوں کے والدین کی نظر اس پر تھی۔ مگر اس کی اپنی نظر منزہ پہ تھی۔ لہٰذا وہ تقریباً ہر روز جا کر منزہ کے دادا کی خدمت کرتا، ان کی چوپال کی صفائی کرتا، ان کی چلم تازہ کرتا، حقہ صاف کرتا اور منزہ کا رشتہ مانگتا۔ دوسری طرف اظہر انکل کو منزہ کی تعلیم کے لیے پیسے درکار تھے لہٰذا وہ ایک دن گاؤں واپس آئے اور منزہ کے دادا کو اس شرط پر کچھ زمین بیچنے پر آمادہ کیا کہ وہ منزہ کی شادی ان کی مرضی سے کریں گے اور گاؤں میں بھی ایک گھر بنوائیں گے اور ہر ماہ کچھ دن کے لیے ان سے ملنے آیا کریں گے۔ یوں فیض اللہ کو ہاں ہو گئی۔ اس نے اپنی کچھ زمین بیچی اور رشتے کو پختہ کرنے کے لیے ڈی۔ جی۔ خان میں ایک دو منزلہ گھر بھی بنوا لیا۔ ابھی چوں کہ شادی سر پر تھی تو اظہر انکل کی فیملی سائیں بابا کے درخت کے پاس اپنے نئے گھر میں موجود تھی۔

صالحہ اپنے سسرال میں تھی جو دوسرے گاؤں میں تھا۔ علی سے بات کی تو اس نے اُسی بچپنے کے ساتھ دانت نکال لیے جیسے ہمیشہ کرتا آیا ہے۔ ذرا فاصلے پہ جا کے کہا: ”سلیم بھائی، باز آ جائیں۔ خدا کا خوف کریں، تھوڑ، چھوڑ دیں پیچھا اس بے چاری کا اب تو۔“

مجھے منزہ کی کوئی درست کہانی ابھی تک نہیں مل رہی تھی۔ چناں چہ میں سارا دن امی جی کے پاس بیٹھا رہتا تا کہ گاؤں کی عورتیں ان کے آگے کچھ اگلیں تو میں بھی کچھ سُن گُن لوں۔ کچھ نے کہا منزہ چوں کہ پڑھی لکھی ہے اور فیض اللہ میٹرک فیل اور منزہ سے عمر میں بھی دس سال بڑا۔ اس لیے وہ خوش نہیں ہے۔ کسی نے کہا اس کو معلوم ہے کہ فیض اللہ ہر وقت نشے میں دھت رہتا ہے۔ کسی نے کہا وہ ہر وقت کھوئی کھوئی سی رہتی ہے۔ ایک عورت نے تو یہاں تک کہ دیا کہ وہ پاگل ہو گئی ہے سو، جب سے گاؤں آئی ہے اُسے گھر سے باہر نہیں نکلنے دیتے اور نہ ہی کسی کو اس سے ملنے دیا جاتا ہے۔ میرا تجسس فطری تھا۔ اس لیے میں نے فیض اللہ کے بارے میں مزید پوچھنا شروع کر دیا۔ کسی نے بتایا کہ یہ منزہ کے دور کے رشتہ داروں میں سے ہے جو پہلے کسی اور گاؤں میں رہتے تھے چند سال پہلے ہی وہاں سے اٹھ کر یہاں آ بیٹھے ہیں۔ اور یہ کہ فیض اللہ کرکٹ کے میچوں پر جُوا لگا لگا کر بہت ساری آبائی زمین گنوا چکا تھا۔ پھر باتوں باتوں میں کسی نے بتایا کہ اس کو اپنے

گاؤں میں لوگ فیضو، فیضو کہتے ہیں اور اس کو ایک بار کرکٹ کے ٹورنامنٹ میں ٹانگ پر کالے بچھو نے کاٹ لیا تھا جس کی وجہ سے وہ تین دن بے ہوش پڑا رہا تھا اور پھر جب لوگ اس پر یٰسین پڑھنے والے تھے تو اٹھ بیٹھا تھا۔

''دھاڑ وَئے......'' مجھے فیضو کا وہ جملہ یاد آیا جو اس روز سے میرے کلام کا حصہ بن گیا تھا جس دن میں نے اسے اس کے منہ سے سنا تھا۔ فیضو داؤ والی سے نیا نیا کاٹھ گڑھ آیا تھا۔ اس لیے میرے گاؤں میں شاید کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ بچھو نے دراصل فیضو کی ٹانگ پر نہیں کاٹا تھا۔ منزہ کے دادا اور اظہر انکل منزہ جیسی نفیس لڑکی کو اس ادھیڑیے کے حوالے کرنے جارہے تھے۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میں اٹھا اور اپنا وہ بیگ ڈھونڈنے لگا جس میں مَیں نے گاؤں والوں کے تحفے رکھے تھے۔ بیگ امی جی نے اُس کمرے میں جا رکھے تھے جس کو ہم ساتواں کمرہ بروزنِ ساتواں عجوبہ کہتے تھے، اس لیے کہ ایک تو وہ کمروں کی ترتیب میں ساتویں نمبر پر آتا تھا اور دوسرا اس لیے کہ اس میں امی جی نے اپنی پرنانی کے جہیز کی چیزوں سے لے کر میری پوتیوں (ہونے والی) کے جہیز تک کی چیزیں سنبھال کر اسے ایک جہیز میوزیم بنا رکھا تھا جو اگر عوام الناس کے لیے کھول دیا جائے تو روزانہ یہاں گارڈن آف گاڈز سے زیادہ لوگ آیا کریں۔ میں اس کمرے میں گیا اور بڑے بیگ میں سے وہ ہینڈ بیگ نکالا جو میں نے منزہ کی امی کو تحفتاً دینے کے لیے خریدا تھا۔ سکینہ آنٹی سے ملنا میری مجبوری تھی اور مجبوری بہ ذات خود موجد ہوتی ہے۔ وہ بیگ ان سے ملنے کا ایک بہترین وسیلہ بن گیا تھا۔ میری نظر ہینڈ کیری پر رکھی تاج والی لڑکی کی ڈائری پر پڑی۔۔۔ مگر ابھی میرے پاس اس کے لیے کوئی وقت نہیں تھا۔ اس وقت میرے لیے سب سے اہم منزہ تھی۔

بیگ لے کر میں تقریباً بھاگتا ہوا امی جی کے پاس گیا جو گھر کے صحن میں اس نیم کے سائے میں بیٹھی تھیں جس میں ابو جی کی رہا کی ہوئی کونجوں میں سے ایک ہر سال آ کر بیٹھا کرتی تھی۔ سلامِ عقیدت کہنے۔ اس صحن کی زیارت کرنے جہاں محبت کو عزت کی نگاہ سے

دیکھا جاتا ہے۔

''امی جی، میں منزہ کی امی کے لیے یہ پرس لایا تھا۔ چلیں آئیں انہیں دے کر آتے ہیں۔'' میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

''سکینہ تو شادی کی شاپنگ کرنے ڈیرے گئی ہے، سلیم۔ ورنہ میں جاتی ناں اس سے ملنے۔''

''چلیں منزہ کو دے دیں گے۔ پر ابھی چلیں۔'' میں نے انہیں اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

''ہائے سلیم، آہستہ بولو۔ پرائی بالک بیٹی سے تم کیسے ملو گے۔ یہ کاٹھ گڑھ ہے تمھارا امریکہ نہیں کہ جس سے چاہو مل لو۔''

امی نے مجھے تنبیہ کی تو کچھ وقت لگا مجھے اپنا آپ سمیٹ سموٹ کر واپس گاؤں لانے میں۔ مگر اس سمیٹنے نے بہت تھکا دیا۔ میری سانس پھول گئی اور میں وہیں چارپائی پر ڈھے گیا۔ ماں نے دایاں ہاتھ میرے سر پر رکھا اور اپنی انگلیوں سے میرے بالوں میں کنگھی کرنے لگیں۔

''اس کے دادا کٹر شیعہ ہیں، تمہارے ابو کٹر دیوبندی۔۔۔''

امی جی نے بس اتنا ہی کہا اور خاموش ہو گئیں۔

کچھ وقت کے بعد میں آرام سے اٹھا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا گھر سے باہر آیا، اور باہر آتے ہی مشرق کی طرف دوڑ لگا دی۔ گلی کے کچھ ننگے بچے اور بھوک سے نڈھال کتے اسے تفریحِ طبع کی کوئی مشق سمجھ کر میرے ساتھ دوڑنے لگے۔ میرے اس قافلے کی منزل سائیں بابا کا کیکر تھا۔

کیکر اب پہلے سے بھی بڑا اور گھنا ہو چکا تھا۔ اس کے اردگرد کافی جگہ اب بھی خالی پڑی تھی۔ اس پر لگے دھاگوں اور جھنڈوں کی تعداد کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ زمانے کی بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں نے، غربت نے، جنگوں اور دھماکوں نے لوگوں کے مسائل میں اضافہ ہی کیا تھا۔ کیکر کا سرسری جائزہ لے کر میں وہیں اس کے سائے میں بیٹھ گیا۔ کچھ بچے بھی مجھ سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئے۔ باقی ایک ایک کر کے واپس لوٹ گئے۔ سبھی کتے بھی ان کے پیچھے اٹھکیلیاں کرتے واپس بھاگ گئے جیسے ان سب کا مقصد ہمیں وہاں تک چھوڑنا ہی تھا۔ میں وہیں بیٹھا تھا

کہ کہیں سے دو فقیر اُدھر کو آ نکلے۔ ان کے لمبے لمبے بال تھے، لمبے لمبے چوغے پہن رکھے تھے اور گلے میں قسما قسم کے ہار لٹکائے ہوئے تھے۔ ان کے کانوں میں بالیاں تھیں اور پاؤں ننگے تھے۔ ایک کے گلے میں ایک چھوٹی سی ڈھولک بھی لٹکی ہوئی تھی، اور ہاتھوں میں دو لکڑیاں تھیں۔ دوسرے کے ہاتھوں میں سبز کپڑے کے دو ٹکڑے تھے۔ سائے میں پہنچتے ہی دونوں آرام سے بیٹھ گئے۔ اس قدر خاموش کہ جیسے گونگے بہرے ہوں۔ ان کے آنے سے پہلے بھی وہاں کوئی نہیں بول رہا تھا مگر اب تو جیسے سکوت ہی طاری ہو گیا۔

کچھ دیر بعد ڈھول والے نے آہستہ آہستہ سر ہلانا شروع کیا۔ جیسے اپنے اندر کی دھن پر مست ہو رہا ہو۔ دوسرا اب بھی مجسمہ بنا بیٹھا تھا۔ ڈھول والے کے بال ایک ردھم سے لہرانے لگے۔ میں دیکھتا رہا۔ اچانک ڈھول والا اٹھا اور پوری قوت سے ڈھول پر لاٹا مارا۔

جیسے اس دنیا کے تمام کٹڑوں کے سر پر چوٹ لگا رہا ہو۔

ڈھول کی تھاپ چل پڑی تو دوسرے فقیر میں بھی جان آنے لگی۔ وہ بھی اٹھا اور جھنڈیاں لہراتا ہوا رقص کرنے لگا۔ وہ ایک دائرے میں چل رہے تھے۔ مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ میں ان کے ساتھ اس دائرے میں کب اور کیسے شامل ہوا مگر وہ دائرہ تھا بڑا ہی دل انگیز۔ جیسے ہی مکمل ہوتا ایک خاص طرز کی سرشاری میرے اندر اتر آتی اور میں پھر سے گھوم گھوم جاتا۔ میرے ہاتھوں میں عجب طاقت سی آ گئی تھی، جب کہ اعضا میں موسیقیت سی۔ ہمارے اردگرد گاؤں کے لوگ جمع ہونے لگے۔ جن کے ساکت پن کو ہم نے اپنے رقص کا محتاج کر کے رکھ دیا۔ ہماری نظروں میں وہ بھی گھومے جا رہے تھے۔ لوگوں کے لیے شاید سب سے زیادہ تفریح کا باعث میں تھا۔ اس لیے سبھی مجھے ہی گھور رہے تھے۔

سب سے پہلے ڈھول والا گرا۔ ہم دونوں اسی تال کی گونج پر ناچتے رہے۔ پھر دوسرا فقیر گرا۔

''بشکو فقیر!''

''زندہ باد!''

اس کے گرتے ہی لوگوں نے نعرہ لگایا۔ سو بشکو نائی سبز جھنڈیاں لے کر گاؤں لوٹ آیا تھا۔ میں اب بھی رقصاں تھا۔ پھر لوگوں میں سے کسی نے آگے بڑھ کر مجھے پکڑا اور وہیں بٹھا دیا۔ قریب کے ایک گھر سے کوئی بچہ ٹھنڈا پانی لے آیا اور ہمیں پلانے لگا۔ مجھے لگا یہ پانی میرے مشن کا آبِ حیات ہے اور میرا مشن محبت کو تلاشنا، اس کی ست رنگی کو اوڑھنا، اس کی خوش بو میں نہانا، اس کی برکھا کو پینا، اور پی کر فنائے محبت ہونا تھا۔ اسی آب سے توانائی پا کر میں اچھل کے اٹھا اور ایک مرتبہ پھر ناچنے لگا، کچھ گاؤں والے ہنسنے لگے۔ کچھ نے جیبوں سے موبائل نکال کر ویڈیو بنانا شروع کر دی، جب کہ ایک چھوٹے سے قد کے جوان نے آگے بڑھ کر مجھے کمر سے پکڑا۔ پھر سنجیدہ ہو کر کہا:

''بس کر، اڈّو۔ بس کر''۔

میں نے غور سے دیکھا تو وہ رمظی تھا۔ رمظی جو شرارت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا تھا، آج میری حالت پر رنجیدہ بھی تھا اور سوال بھری نظروں سے میرے چہرے کو ٹٹول بھی رہا تھا۔ رمظی کے سر پر سر رکھ کر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا میں واپس گھر آیا۔ میری حالت دیکھ کے ماں روئیں بھی اور ہنسیں بھی۔ پھر ایک بستر بنایا اور مجھے اس پر لٹا دیا۔

شام کو مجھے تیز بخار ہو گیا۔ گاؤں کے لوگ جمع ہونے لگے۔ کچھ ملنے کی غرض سے اور کچھ میری 'بیماری' کا سن کر روایتی تیمارداری کے لیے۔ وہ مجھے کوئی پھکی یا دم کی ہوئی ڈسپرین وغیرہ دیتے اور ساتھ ہی مجھ سے اپنے کسی بچے کا نام پوچھتے۔ بہ ظاہر تو یہ کہتے ہوئے کہ کہیں میں امریکا جا کر اپنے دوستوں، رشتہ داروں کو بھول تو نہیں گیا۔ مگر اصل میں وہ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ آیا میری دماغی حالت بہتر ہو رہی تھی یا اب بھی دھمال والا جن سوار تھا۔ منزہ کے نئے گھر کے بغل میں رہنے والی ایک خاتون نے امی جی سے ہمدردی کرتے ہوئے کہا:

''سلیم بچارا کیا کرتا۔ کتنی دیر روکتا خود کو؟ ان فقیروں کے ڈھول میں بہت طاقت ہے، اُمڑی۔ یہ کسی کو بھی نچوا سکتے ہیں۔ اور تو اور اظہر کی بیٹی نمیں ہے، سکینہ کی لڑکی؟ وہ بھی نمیں سہہ پائی ان کے

ڈھول کو۔اس نے پہلے پانی بھجوایا بشکو فقیر کے دربار میں اور پھر گھر کے صحن میں دھمال ڈال لی۔ میں نے آپ دیکھا اپنی آنکھوں سے، کندھ کے اوپر چڑھ کے۔اس وقت ڈھول بھی بجنا بند ہو گیا تھا۔سکینہ بچاری آگے ہی پریشان ہے۔بس اللہ خیر کرے،سب کے بچوں کو اپنی پناہ میں رکھے۔امڑی، میری زاری، توبہ۔"

میں بخار میں شرابور تھا۔منزہ کی کتھا سنی تو قہقہہ لگا کے ہنس دیا۔جس پر وہ ماسی بہت کنفیوز ہوئی اور کانپتی ہوئی آواز میں ایک آدھ اور بات کی اور اٹھ کر چل دی۔

'سلیم میاں!' میں نے سوچا۔وہ پانی پیار کا پانی تھا۔دھمال کے لیے آبِ حیات منزہ نے بھیجا تھا۔وہ بالٹی اس نے اپنے ہاتھوں سے دھوئی تھی۔اس نے وہ گلاس،خوب صورت کنگری والا گلاس پیندے سے پکڑا ہوگا اور اس بچے کو بلا کر کہا ہوگا: 'جاؤ میرے بھائی، یہ پانی ان فقیروں کو دے آؤ۔' اس نے مجھے بھی فقیر کہا ہوگا۔میں نے ایک مرتبہ پھر قہقہہ لگایا۔

"سوجاؤ، سلیم۔" امی کی سسکیوں بھری آواز آئی۔

'بشکو نائی کا فقیر۔' میں نے ایک مرتبہ پھر قہقہہ لگایا۔

سفرِ محبت میں اب تک میں ہی میں تھا۔خود کی چاہت تھی کہ مجھے اپنے حصار میں لیے ہوئے تھی۔میں نے جو پنیری لگائی تھی، شجر ہوئی تو میں اس کا پھل تخم سمیت کھانے لگا، یوں میری محبت اپنے ہی دائرۂ تولید میں مقیّد ہو کر رہ گئی تھی۔خود سے محبت کے بعد والا مرحلہ طے ہی نہ ہوا تھا: خود کی نفی کا مرحلہ۔شاید میری میزان ہی غلط تھی۔توازن چاہت اور خود پسندی کا نہیں بل کہ تھا ہی نفی اثبات کا۔جیسے ایٹم کو منفی مثبت کی میزان مکمل کرتی ہے ناں، ویسے ہی محبت بھی ادراکِ ذات سے فنائے ذات کی میزان سے کامل ہوتی ہے، اور انسان محرابِ محبت سے معراجِ محبت کو پہنچنے کے قابل ہوتا ہے۔آج بشکو فقیر کے ساتھ دھمال میں اتر کر میں سفرِ محبت کا حتمی مرحلہ طے کر آیا تھا۔اس وقت تن بدن میں اگرچہ اک آگ سی لگی ہوئی تھی، میرا مَن شانت تھا۔

یاد نہیں کب بخار اور نیند کی لڑائی دیکھتے دیکھتے بشکو نائی کا یہ فقیر سو گیا۔

--☆--

اگلے دن میری حالت بہتر تھی۔میں صحن میں ٹہلتا رہا۔امی مجھے چیزیں بنا کر کھلاتی پلاتی رہیں۔سہ پہر میں مجھے نیم کے درخت کے نیچے ایک چارپائی ڈال دی اور کہا کہ اب بہت واک ہو گئی، ذرا آرام کر لو۔سچ کہتی تھیں، رات کے بخار نے میری جان نکال لی تھی۔میں لیٹتے ہی نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

--☆--

میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔مجھے شدید پیاس لگ رہی تھی۔اردگرد دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا سوائے امی جی کے جو رات بھر جاگتی رہی تھیں اور اب ساتھ والی چارپائی پر سکون سے سو رہی تھیں۔میں چپکے سے اٹھا اور بھاگتا ہوا کیکر کے پاس پہنچ گیا۔بشکو فقیر اپنے مرید کو لے کر گویا میرا منتظر بیٹھا تھا۔میں ابھی چند قدم دور ہی تھا کہ ڈھول والے نے چھلانگ لگا دی۔میں نے شہادت کی انگلی ہوا میں بلند کی اور جہاں تھا وہیں ساکت ہو گیا۔ڈھول والے نے چوٹ لگائی۔میں ٹھہرا رہا۔پھر جوں ہی بشکو اُچھل کے گھوما، میں گھومتا ہوا ان سے جا ملا اور گھومتا ہی چلا گیا۔مجھے لگا محبت خطِ مستقیم کی محتاج نہیں ہے۔اس کا سفر دائروی ہوتا ہے۔اسی لیے کائنات کی کوئی محبت بھی یک طرفہ نہیں ہوتی۔مرکز کشش نہ کرے تو محور ہو ہی نہیں۔

میں سائیں بابا کے کیکر کے نیچے گھومتا رہا۔وہ کیکر، اردگرد کے گھر، پورا کا پورا گاؤں، نیلا آسمان، سب گھومتے رہے۔دل کی آہ، نظر کی ادا، لبوں کی لالی، زبان کی شوخی، سب رقصاں رہے۔عاشقوں کے وعدے، وصل کے ارادے، پیدل پیادے گھومتے رہے۔براتیں جھومتی رہیں۔چوڑیاں کھنکتی رہیں۔شہنائیاں بجتی رہیں، ڈولیاں جھولتی رہیں، گھونگھٹ اُٹھتے رہے...... ہم گھومتے گھومتے گر گئے مگر آسماں گھومتا رہا۔محبت کا دھمال جاری رہا۔زمیں گھومتی رہی۔یا خدایا! یہ رک کیوں نہیں جاتی۔میری نظر اس بچے پر پڑی جو پیاسے کنوئیں سے ڈول بھر کے ڈگمگاتا آ رہا تھا۔

☆

اگلے تین روز بھی میرا یہی معمول رہا۔ ہر شام میں کیکر تلے جاتا اور فقیروں کے ساتھ دھمال ڈالتا اور اس وقت تک ڈالتا رہتا جب تک اُس کا دم کیا ہوا پانی نہ آ جاتا۔ ہر دائرے کے مکمل ہونے پر مجھے ایسے لگتا جیسے میں خود دھمال ہو گیا ہوں، میری زندگی کا دائرہ پانی سے شروع ہو کر پانی پر مکمل ہو گیا۔

تیسرے دن میں گھر سے ذرا جلدی نکلا اور سادہ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کی نیت سے قبرستان چلا گیا۔ اس کی قبر کے کتبے پر لکھا تھا:

''شہیدِ راہِ حق:

مولانا محمد صادق عرف سادا''

کچھ دیر مَیں اس کی قبر پہ بیٹھا رہا، باتیں کرتا رہا۔ اس کے مفلسی کے دن یاد آئے، اس کے پھٹے ہوئے، پیوند لگے کپڑے یاد کیے، پھر گلہ کیا کہ یار تم مولانا ہو گئے تھے، ہمیں بتایا بھی نہیں۔ میں وہاں بیٹھ کے رویا بھی اور ہنسا بھی۔ شکوہ بھی کیا اور معافی بھی مانگی۔

پھر وہاں سے اٹھ کر میں ایک اور قبر پہ گیا۔ ماسٹر جی کی قبر پہ۔ وہاں بھی فاتحہ پڑھ کر میں تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ گیا۔

''کہاں پہنچی تلاشِ گمشدہ، سلیم میاں؟'' ماسٹر جی پوچھ رہے تھے۔

''ڈھونڈ لی، ماسٹر جی۔'' میں نے روتے ہوئے کہا۔

''کہاں ہے آپ کی محبت؟'' ماسٹر جی کی کڑک دار آواز آئی۔

''جہاں پہلی بار بتایا تھا، ماسٹر جی، وہیں۔'' میں نے اونچی آواز میں روتے ہوئے کہا۔

''ارے بھائی، کیوں پہیلیاں بجھوا رہے ہیں؟''

''منزہ کے دادا کے کھسے میں۔''

میں نے حتماً کہا اور اٹھ کر اسی کیکر کی طرف بھاگ پڑا جہاں بشکو اپنے بے نام و بے زبان چیلے کے ساتھ میرا منتظر بیٹھا تھا۔

میں بھی جا کے بیٹھ گیا۔ چند لمحے ہماری محفل میں خاموشی راج لاگو رہا۔ پھر بشکو اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے روبرو آ بیٹھا۔

''مولبی کون ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''فیفو۔''

جواب دے بیٹھا تو میں نے خود کو معرفت کی کسی اگلی منزل پر محسوس کیا۔

''یہ بھی نائی ہے۔'' بشکو نے ہنس ہنس کے اپنے چیلے کو بتایا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''یہ بھی نائی ہے، یہ بھی نائی ہے، یہ بھی نائی ہے۔۔۔'' بشکو نے ضد کی۔

میرا دماغ بشکو کے قبضۂ قدرت میں آیا اور میں چلا کر کہنے لگا:

''ہاں میں نائی ہوں، میں نائی ہوں، میں نائی ہوں۔۔۔''

دور سے سننے والوں کو لگا ہو گا کہ میں کہہ رہا ہوں:

''میں نہیں ہوں، میں نہیں ہوں، میں نہیں ہوں۔۔۔''

''گرو!'' بشکو کے بے زبان چیلے کے لبوں میں پہلی بار جان آئی۔

''یہ...... یہ...... یہ ناں...... گرو یہ ناں ہی ہی ہیجڑا ہے، ہیجڑا ہے یہ۔''

لفظ کے بجائے میرا دھیان آواز پہ گیا۔ مجھے لگا جیسے میں نے یہ آواز کہیں سن رکھی ہے۔ صوتی یادداشت کے سہارے بے نام فقیر کو ٹٹولا تو میں ہکا بکا رہ گیا۔ آگے بڑھ کے میں نے اس کے چہرے سے بال ہٹائے، آنکھوں میں جھانکا اور اونچی اونچی آواز میں کہا: ''عامر! عامر! عامر ہو؟ تم تو عامر ہو! یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے، میرے دوست؟''

''ای ای ای ایشوریا م م م مر گئی ہے۔ سخی سرور دربار پر ب ب بارش ہو گئی تھی...... م م م م میں

اور گر و بچ گئے ہیں۔ ہم بچ گئے، وہ مم مم مر گئی تھی۔‘‘

’’خودکش دھما کہ۔ دھما کے کو بارش کہتا ہے۔‘‘ بشکو نے وضاحت کی۔

’’بجادو آج۔‘‘

اس سے پہلے کہ میں پوری بات کو سمجھ پاتا بشکو نے عامر فقیر کو کمانڈ دی اور ہم ناچنے لگے۔ آج ہم اتنا ناچے کہ زمین ہلنے لگی۔ آسمان سرخ ہونے لگا۔ کیکر چلنے لگا۔ ناچتے ناچتے ہم گاؤں کی گلیوں میں گھس گئے۔ کچھ بچے اور کتے بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گئے۔ یقیناً کئی مقامات پر خواتین نے دیواروں کے اوپر سے مجھے فقیروں کے ساتھ ناچتے ہوئے دیکھا ہو گا۔ حیران ہوئی ہوں گی۔ مگر میں تو خود ہی حیرتوں کے سمندر میں غوطے لگا تا جا رہا تھا۔ بشکو نے مولوی امان اللہ اور فیضو کے گھروں پہ مٹی پھینکی۔ آگے بڑھے تو منزہ کے دادا کی چوپال آئی۔ ہم ناچتے رہے۔ بشکو ہاتھ جوڑ کر ٹھہر گیا۔ بہت دیر کے بعد ہم گاؤں کے گرد اپنا چکر مکمل کر کے آئے تو کیکر کے نیچے پیاسے کنوئیں کا ڈول ہمارا منتظر تھا۔ ساتھ خوب صورت کنگری والا گلاس رکھا تھا۔ میں نے جھک کر اسے اٹھانا چاہا تو پانی میں چاند کا عکس نظر آیا۔ میں نے پلٹ کر اوپر دیکھا اور پھر رقصاں ہو گیا۔ اب کی بار بشکو نے مجھے پکڑ کر بٹھایا۔ عامر نے میرے منہ میں پانی ڈالا۔ پھر وہ دونوں مجھے گھر تک چھوڑنے آئے۔ وہیں دروازے پر ہماری ملاقات ابو جی سے ہو گئی۔ وہ میری حالت پر بہت فکر مند تھے۔

جب فکر مندی ایک خاص انتہا کو پہنچتی ہے تو انسان راہِ فرار اختیار کر لیتا ہے۔ ابو تین چار روز سے مجھے قریب آ کے دیکھنے کی ہمت نہیں کر رہے تھے۔ بے نیازی کی ایکٹنگ کر رہے تھے۔ اونچی اونچی پختہ آواز میں بات کرتے تو جملے کو لرزاں نہ ہونے دیتے۔ مگر آج انہیں حقیقت کا سامنا کرنا پڑ گیا تھا۔

انہوں نے بشکو کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا:

’’دیکھ بشکو، میں پیروں فقیروں کو نہیں مانتا۔ مگر میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ میرے بڑے بھائی نے

تمہیں تکلیف دی تھی۔ مجھے اس وقت بھی رنج ہوا تھا، آج بھی ہے۔ میں اس کی تم سے پہلے بھی معافی مانگ چکا ہوں، آج پھر مانگتا ہوں۔ خدا کے واسطے، میرے بیٹے کو بخش دو۔ کچھ دن کے لیے یہاں سے چلے جاؤ۔‘‘

’’سردار صاحب، او ٹھیک اے۔ لیکن اے نائی اے، اے نائی اے، اے نائی اے.....‘‘

بشکو یہ بات تب تک کرتا رہا جب تک عامر فقیر نے اسے پکڑ کر جھنجھوڑا نہیں۔

’’ہی ہی ہی ہیجڑا اے‘‘ اس نے کہا اور بشکو کا ہاتھ پکڑ کر چل دیا۔

ابو جی نے میری حالت بگڑتے دیکھی تو مجھے اپنے کندھے کا سہارا دے کر چلنے لگے۔ محبت نے آج مجھے بوڑھے باپ کے کندھے پر لاد دیا تھا۔ وہ مجھے میرے کمرے تک لائے اور بستر پر لٹا دیا۔

--☆--

﴿۲۵﴾

مَیں رات کے پچھلے پہر جاگا تو بخار اتر چکا تھا مگر میرے کان اب بھی بج رہے تھے۔ کچھ دیر تک مجھے سا سا کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر ذرا غور کیا تو کمرے کے باہر کسی خاتون کے رونے کی آواز آئی۔ پھر دروازہ کھلا اور لائٹ آن ہوگئی۔ امی جی نے مجھے جلدی جلدی بتایا کہ منزہ اور اس کی امی کی اظہر انکل سے لڑائی ہوگئی ہے۔ اس لیے وہ آج رات ہمارے ہاں ٹھہر کر کل صبح ڈی۔ جی۔ خان چلی جائیں گی۔ آج کی رات کے لیے میں نے اپنا کمرہ اُن کے حوالے کرنا ہے کیوں کہ اور کسی کمرے میں ڈبل بیڈ نہیں تھا جس پر دونوں ماں بیٹی سو سکتیں۔ میری سمجھ میں ہمیشہ کی طرح کچھ بھی نہ آیا۔ بس ان کے حکم کی تعمیل کی۔ سر پر ایک کپڑے سے پگڑی سی باندھی اور اٹھ کر چل پڑا۔ اپنے کمرے سے نکلتے ہوئے میں نے سکینہ خالہ کو سلام کیا اور منزہ کو دیکھنے کی کوشش کی مگر بخار کی وجہ سے یا رات کی کم روشنی کی وجہ سے میں اسے ٹھیک طرح نہ دیکھ پایا۔ بس اک مانوس سا سراپا تھا۔

وہ میرے کمرے میں چلی گئیں اور میں ساتھ والے کمرے میں گھس گیا۔

اب میرے بستر پر منزہ لیٹی تھی۔ جب کہ میں دوسرے کمرے کے ایک ٹھنڈے بستر پر۔ میں نئی جگہ سوتا ہوں تو ساری رات کروٹیں بدلتا رہتا ہوں۔ تاہم پھر سے نیند کی نیت کر کے میں نے آیت الکرسی پڑھی، پہلے اپنے سینے پر پھونک ماری، پھر سامنے، پھر دائیں......

یکا یک میری زبان سے ''دھاڑ وے......'' نکلا۔

وہ تاج ریستوران والی سندر لڑکی میرے پیچھے پیچھے میرے گاؤں تک آ گئی تھی؟ میرے گھر، میرے کمرے میں گھس آئی تھی اور اس وقت میرے بستر پر لیٹی تھی۔

مجھے سائبیریا کی وہ کونج یاد آئی جو ابو جی کی بندوق کو للکار کر ہم شکاریوں کے درمیان میں سے اپنی محبت کو بازیاب کرا لے گئی تھی۔

صبح صادق کا اجالا کھڑکیوں کی وِیلکوں سے میرے کمرے میں در آنے لگا۔ میرا بخار اترنے لگا اور اک خمار سا چڑھنے لگا۔

تلاشِ محبت اور تلاشِ محبوب میں فرق سمجھ آنے لگا۔

اپنی تلاش کا زعم پاش پاش ہوا تو مجھے سمجھ آیا کہ دراصل میں محبت کی راہ پر نہیں راہِ فرار پر تھا۔ میری محبت میرے گاؤں میں، کاغذ کی کشتی میں بیٹھی دو دہائیوں سے میری منتظر تھی۔ اور میں اسے دیارِ غیر میں تلاشتا پھرتا تھا۔ بغل والے گھر تک جانا ہو نہ سکا اور میں کرۂ ارض کے الٹی طرف مارا مارا پھرتا رہا۔ مجھے بس اک چھوٹی سی دیوار پھلانگنا تھی اور میں تہذیبوں کے بیچ پھیلے لا منتہا شگاف پھلانگتا پھر رہا تھا۔ میری حالت پالو کوئیلو کے اُس گڈریے جیسی تھی جو اپنے خزانے کے خوابوں کے تعاقب میں صحراؤں کو عبور کرتا اہرام مصر تک جا نکلتا ہے۔ جب کہ خزانہ اسی پیڑ کے نیچے چھپا ہوتا ہے جہاں سے وہ سفر آغاز کرتا ہے۔ مگر کیا اس کا ادراک سفر کے بغیر ممکن تھا؟ کیا اس کے پہلے خواب کی تعبیر اندلس کی چراگاہوں میں ممکن تھی؟ شاید نہیں۔ بالکل اسی طرح اگر میں بولڈر میں راکیز نامی دیو قامت پہاڑوں کے روبرو نہ ہوتا تو شاید میرے بچپن کا وہ ننھا سلیم نہ جاگتا۔ نہ مجھے میرا وہ رومال یاد آتا جس پر میں نے منزہ کا لمس سمیٹنا چاہا تھا اور نہ ہی کاغذ کی وہ کشتی جس پر خیالی سواری کر کے ہم دور نکل جایا کرتے تھے۔

تو گویا میرے سفر کو خدائے محبت کے حضور شرفِ قبولیت عطا ہو گیا تھا؟ میری محنت ٹھکانے لگ چکی تھی؟

نہیں یہ سب اُس کے سفر کی بہ دولت ہوا تھا!

اس کی راہیں زیادہ کٹھن تھیں۔ مجھے اپنا سفر اس کے آگے ہیچ دکھائی دینے لگا۔ اس کا سفر خالص تھا۔ اس کی محرابِ محبت کی سمت متعین تھی۔ ایک ایک قدم باوضو تھا، ہر ہر عمل منزہ تھا۔

اور میرا سفر؟ بے منزل، بے سمت، بے جہت، بھٹکا ہوا۔

ایسا لگا جیسے اس کے سب جتن رائیگاں جانے والے ہیں۔ میری غفلت اور تاخیر کی وجہ سے وہ فیضو جیسے جاہل کی سیج پر بیٹھنے جا رہی ہے اور میں ہمیشہ کے لیے کانٹوں کے بستر پر۔ محبت کا وہ الاؤ جو میں نے برسوں نہ بجھنے دیا اچانک راکھ ہونے لگا۔ بس اک چنگاری تھی جواب بھی مسکرائے جا رہی تھی۔ یاسیت کے اندھیروں کو الوداع کہہ کر میں رجائیت کے گھنے درخت کے سائے میں جا بیٹھا۔ اس کے پتوں سے لڑلڑ کر روشنی میری گود میں اترنے لگی اور سوال پر سوال کرنے لگی۔۔۔

اس جہان میں کتنے لوگ ہیں جنہیں دولت جوڑنے، کھانے پینے، دائرۂ تولید وسیع کرنے اور مر جانے کے علاوہ کسی شے کی کوئی پروا نہیں؟ کتنے ہیں جنھیں محبت کی فکر ہے؟ کتنوں کو زندگی میں محبوب کی شناخت کرنے کی صلاحیت نصیب ہوتی ہے؟ شکر نہیں کرتے ہو کہ آٹے چینی کے بھاؤ کے بجائے تمھیں سوالِ محبت در پیش ہے اور تم تو تلاشِ محبت میں نکلے تھے ناں؟ تو کیا اب محبت کا پتہ مل جانا کافی نہیں ہے؟ کیا دھمال کی سرشاری محبت کا انت نہیں ہے؟ کیا محبوب کے ہاتھ سے پانی پی لینے کے بعد بھی کوئی پیاس باقی رہتی ہے؟ کیا محبوب کا ملنا ضروری ہے؟

جی ضروری ہے۔ میں گڑ دے کر گوہا نہیں لے سکتا۔ میری محبت ادھوری نہیں ہو سکتی۔ میری محبت اور محبوب دراصل ایک ہی ہیں۔ میں جس کی خاطر قریہ قریہ پھرا ہوں، خود سے ہزاروں میل دور گیا ہوں تو خود میں اترنے کے قابل ہوا ہوں۔ ہزاروں میلوں سے بھاگ کر آیا ہوں تو من کے سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں کود سکا ہوں۔ برسوں کے کشٹ کاٹے ہیں تو لمحوں کو کشید کرنا سیکھا ہے۔ پیاسے کنوئیں کا پانی پیا ہے تو ابلتا ہوا چشمہ چل کے میرے پاس آیا ہے۔

اب لبِ دریا کیسے پیاسا بیٹھوں اور نہ تڑپوں؟ یکا یک ہر سو روشنی پھیل گئی۔ جیسے رجائیت کی ساری کرنیں ایک ساتھ میری جھولی میں اتر آئی ہوں۔ کمرے کی لائٹ آن ہو چکی تھی اور امی جی مجھے اٹھنے کو کہہ رہی تھیں۔

"مہمان ہیں میرے کمرے میں؟" میں نے 'منزہ چلی تو نہیں گئی' کہنے کے لیے ان الفاظ کا تکلف کیا۔

"ہاں جی، منہ ہاتھ دھو کر سکینہ سے مل لو۔ اتنے عرصے سے نہیں دیکھا اس نے تمہیں۔ وہ بھی دے دینا یاد سے۔ یاد ہے ناں سارا دن تمہیں چیزیں کھلاتی رہتی تھی۔ تم اس کے گھر سے نکلنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے اور منزہ تمہاری "سہیلی" بے چاری۔"

امی خاموش ہوئیں تو میرا دل ڈوبنے لگا۔

"وہ بھی اتنی بڑی ہو گئی ہے اور خوب صورت بھی۔ اللہ کرے فیضو تو...... مر جائے۔ اتنی پیاری، پڑھی لکھی چھوکری ہے ہماری اور اس نشئی جواری کو مل رہی ہے۔ میرا دل کوئلے ہوتا جا رہا ہے۔ سکینہ بھی کتنی بھولی ہے، اپنی چن جیسی لڑکی کو ڈنگر کے حوالے کر رہی ہے اور مرے کیا نہ کرے، منزہ کے دادا ہیں ہی ایسے ظالم انسان، عاق کر چھوڑیں گے اظہر کو سب جائیداد سے......"

امی کی پرانی عادت تھی۔ مجھے جگانا ہوتا تو کمرے میں چلتی پھرتی کام کرتی رہتیں اور مجھ ادھ سوئے، ادھ جاگے کو کوئی کہانی سنائے جاتیں۔ کبھی کسی کے پاس ہونے کی، کبھی کسی کی نوکری ہو جانے کی، کسی کی شادی کی، کبھی بی بی سی پر سنی ہوئی کسی خبر کی اور کبھی کوئی نئی بات نہ ہوتی تو پرانی سنا دیتیں۔ مجھے ان کا یہ طریقہ زہر لگتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ جگا کے مجھے اٹھ جانے پر مجبور کر دیتی تھیں۔ مگر آج جانے کیوں ان کی منزہ سے یہ ہمدردی اتنی بھائی کہ مجھے ان کی وہ ساری کہانیاں اور جگانے کا یہ طریقہ بھلا لگنے لگا۔ جی چاہ رہا تھا کہ میں لیٹا رہوں اور وہ فیضو کو کوستی رہیں مگر پھر جب انھوں نے مجھے یہ یاد دلایا کہ منزہ اور اس کی امی نے ناشتہ کر کے ڈی جی خان چلے جانا ہے تو میں چھلانگ لگا کر بستر سے اٹھا اور امی کو اپنے پاس بلایا۔

"امی جی! آپ کو گاؤں کی بہو چاہیے ناں؟"

''ہاں، سلیم۔''

''بس پھر کچھ بھی ہو جائے مجھے آج منزہ سے ملنا ہے۔ پردے وغیرہ کا تکلف نہ کیجیے گا، ہم امریکہ میں مل چکے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' امی جی نے شدید حیرت سے کہا اور میں بھاگ کر باتھ روم میں گھس گیا۔

میں لوسلو قسم کا نہایا اور بالوں اور کاندھوں پر پھنسے شیمپو کو تولیے سے صاف کر کے کپڑے پہنے اور ساتویں کمرے میں گیا جہاں میرا سامان پڑا تھا۔ میں سکینہ آنٹی کا بیگ اٹھانے لگا تو ایک بار پھر مجھے وہ ڈائری نظر آئی جو مجھے تاج والی بل کہ اپنے والی منزہ نے دی تھی۔ میں نے اسے اٹھایا۔ جلدی جلدی صفحے پلٹے اور وہ صفحہ ڈھونڈا جس پر لکھا تھا: ''بنامِ محبت!''

''میرے دل کے مقتدر، قیسِ لیلیٰ، ہیر کے رانجھا، میرے میرزا، عدم سے میرے آدم خان، میری سبھی مرادوں کے شہ مراد! میں تمھیں کس نام سے پکاروں کہ میری آہوں میں اثر آئے اور میری صدائیں تمھارے دل کے بند دریچوں کو وا کر دیں؟ تمہارے کس نام کا تعویذ پیوں کہ میرا دلِ ناساز رُو بہ صحت ہو؟ میرے صحنِ دل میں کوئی گل کھلے، کچھ کرنیں اتریں؟ مجی! تم اتنی جگہوں پر ہو کہ سمجھ نہیں آتا تجھے کہاں ڈھونڈوں۔ کاغذ کی کشتی میں، ندیا کے پانی میں، میگھا کی بدلی میں، یہاں کے شہروں میں یا وہاں کی علم گاہوں میں؟ کہاں ملوں میں تم سے؟ مہِ تاب! تم مجھ سے کیوں روٹھے ہو کہ میں جہاں بھی جاتی ہوں تم اٹھ کے کہیں اور جا بیٹھتے ہو؟ تمہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر، تمہارے پیچھے چل چل کر میں تو تھک گئی ہوں۔ تدبیریں کرتے کرتے ہلکان ہوئی ہوں۔ اب تم ہی بتا دو کہ کیا کروں؟ تم نے تو عقلِ سلیم پائی ہے ناں تو بتا دو کیا کروں...... کیا کروں؟''

اس سے آگے سرخ قلم سے ٹیڑھا میڑھا سا لکھا تھا: ''سلیم!!! گاؤں جلد آنا۔ جلدی جلدی آنا۔ میں تھک گئی ہوں۔ اکیلے نہیں لڑ سکتی ہوں سب سے۔ تھک گئی ہوں میں! قسم سے تھک گئی ہوں۔''

--☆--

میں کمرے میں داخل ہوا تو وہاں سامنے امی جی اور سکینہ آنٹی بیٹھی تھیں۔ امی جی کی آنکھوں میں حیرت اب بھی واضح تھی۔ منزہ نے ایک بہت بڑی سی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ جو کرسی میرے لیے خالی پڑی تھی اس سے ایسے زاویے پر ہو کے بیٹھی کہ چہرے کا کوئی ہزارواں حصہ ہی نظر آ رہا تھا۔

میں سکینہ آنٹی سے باتیں کرنے لگا۔

''تو تم کب کرو گے شادی؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جب آپ لوگ، میرا مطلب ہے امی جی اور آپ کہیں گے۔''

''کوئی لڑکی ڈھونڈی ہے کہ نہیں؟''

''نہیں سکینہ آنٹی۔ ان کاموں کا وقت ہی کہاں تھا۔ ابھی تک تو بس پڑھائی ہی کی ہے۔''

ہرنی کی سی سرعت سے منزہ کا چہرہ گھوما۔ اگر ہم وقت کے اُس جھولے پر بیٹھے ہوتے جسے لوگ بچپن کہتے ہیں تو منزہ میرا جھوٹ پکڑنے پر تالی بجاتی اور اونچی آواز میں کہتی: ''جھوٹے، تم تو کہتے ہو میں جھوٹ نہیں بولتا۔ 'ابھی تک تو بس پڑھائی ہی کی ہے' اچھا؟ جہاز میں تو بڑے سچ بولے، اب کیا ہوا، جناب؟''

مگر وہ خاموش رہی۔

''ہمیں بلانا ضرور......''

''جی آنٹی میں تو سب سے وعدے کر رہا ہوں کہ بلاؤں گا، مگر پتا نہیں ہمیں کوئی کیوں نہیں بلاتا۔''

منزہ اٹھ کر ساتھ والے کمرے میں چلی گئی۔

''طعنے تو تم اتنے سے تھے تب بھی بڑے ڈھنگ کے دیتے تھے۔ ایک تو منزہ کی شادی کی تاریخ اتنی جلدی میں طے ہوئی۔ دوسرا نہ میں خوش، نہ یہ خوش۔ پھر بھی ہم نے تمھارے اس گھر میں نائی بھیجا۔ ڈیرے والے گھر بھی بھیجا۔ مگر آپ لوگ اسلام آباد والے گھر شفٹ ہو گئے تھے۔ وہاں میرا کون آتا؟ اب تو خیر پتا نہیں کیا بنتا ہے۔ ہم ماں بیٹی تو ناں کر آئی ہیں۔''

کچھ دیر امی جی، سکینہ آنٹی اور میں خاموشی سے ناشتہ کرتے رہے۔ پھر میں نے سکینہ آنٹی

کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور کہا:

''سکینہ خالہ، اگر آپ اجازت دیں تو میں ذرا منزہ سے مل لوں؟''

''مل لو پتر۔ بس اتنا یاد رکھنا کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ یہ خبر اگر فیقو تک پہنچ گئی تو میرا لکھ نہیں بچے گا۔ وہ بے غیرت ہمیں بدنام کر دے گا۔ میری بیٹی در در پہ رُلتی پھرے گی۔''

''ایسا کبھی نہیں ہوگا، آنٹی۔'' میں نے تیقن کے ساتھ کہا اور اپنی اور منزہ کی چائے اٹھا کر دوسرے کمرے میں چلا آیا۔

یہ دوسرا کمرا میرے گاؤں کے کمرے سے ویسے ہی منسلک تھا جیسے کارنر روم میرے بولڈر والے کمرے سے۔ مگر یہاں نہ تو کوئی نرم و گداز صوفہ رکھا تھا اور نہ ہی دیوار پر ایل ای ڈی سکرین لگی تھی۔ کمرے کے درمیان میں ایک پرانی چارپائی پڑی تھی اور دیوار پر میری بچپن کی ایک تصویر لٹک رہی تھی۔ اسی چارپائی پر بیٹھی منزہ میری تصویر کو یوں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی جیسے اس میں اپنا کچھ گم کر بیٹھی ہو۔

اشک اس کی صراحی صفت گردن کے کانچ سے پھسل کر قمیص میں ڈوب رہے تھے۔

''منزہ چائے......''

ایک لمبی سانس، خاموشی، آنسوؤں کی برسات۔

میں نے کپ فرش پر رکھ دیے۔

''منزہ......رومال۔''

مزید آنسو۔ خاموشی۔

''میں یہاں بیٹھ جاؤں۔'' میں نے دراصل چارپائی پر بیٹھنے کے بعد پوچھا تھا۔

وہ فوراً چارپائی سے اٹھ گئی۔ میں بھی اٹھ گیا۔

اب میں کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ اور وہ دوسری کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے اور خدا گواہ ہے اس نے اب تک ایک بار بھی نظر اٹھا کر میری طرف نہیں دیکھا تھا اور بہ خدا وہ مجھے جی بھر

کے دیکھنے کو تڑپ بھی رہی تھی۔ مگر نہ تو یہ بولڈر تھا اور نہ ہی کارنر روم کا صوفہ۔ ہم ایک ایسی تہذیب کے آنگن میں کھڑے تھے، حیا جس کا اولین تقاضا تھا۔

''منزہ......''

صوتی التجا کو منزہ کے لُڑکی دار کانوں تک پہنچانے کے لیے مجھے اونچا بولنا پڑ رہا تھا۔ سو میں ایک قدم آگے بڑھا۔ منزہ نے اپنے آپ کو یوں سمیٹا کہ حسن و حیا کی سبھی تمثیلیں اس کے قدموں میں آ گریں۔

''بولڈر میں تو تم اتنا نہیں شرماتی تھی؟'' میں نے اسے چھیڑنے کے انداز میں کہا۔

اس کے آنسو وہیں تھم گئے۔ پلکوں کا حجاب اتار کر اس کی آنکھیں میری آنکھوں سے ملیں۔ ہمیشہ کی طرح اک بجلی سی لپکی، شعلہ سا چمکا۔

''یہ تم کہہ رہے ہو، سلیم؟'' اس نے دھیمے سے کہا اور پھر خاموش ہو گئی۔ غصے سے اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں؛ چہرہ سرخ ہو گیا؛ وہ کہہ رہی تھی:

''یہ تم کہہ رہے ہو جو تین سال بولڈر کی مادر پدر آزاد لڑکیوں کے خمار میں سر دھنتا رہا۔ یہ تم کہہ رہے ہو جس کی خاطر میں نے خود کو بدلا۔ خود فریبی کی۔ روح سے الگ کر کے اس جسم کو دیارِ غیر کے بازاروں میں لے آئی۔ دل کے اَن مول ہیرے کو تجھ سے ہرجائی کے پیچھے پیچھے لیے پھری۔ اپنا آپ داؤ پر لگایا۔

تصور کر سکتے ہو مجھے دادا ابو جی سے، ابو جی سے، امی جی سے، اور اپنے آپ سے کتنی بار لڑنا پڑا ہوگا؟ یہ سوال تم کر رہے ہو، جس نے ایک بار فیس بک پہ لکھا: 'آج سے تاج میرا پسندیدہ ریستوران ہے' اور مَیں جا کے وہیں نوکر ہو گئی، بل کہ مستقل قیام پذیر ہو گئی۔ چوبیس گھنٹے وہیں گزارنے لگی کہ کبھی کبھی تو وہاں آؤ گے۔ مگر میں نے تجھ جیسا سرمایہ دار نہیں دیکھا، سلیم۔ میرے جسم، میری جان، میری روح، میرے دل کو، میری ہستی کے سبھی اثاثوں کو تم نے ایک خواب کے عوض گروی رکھ لیا۔ میں اس خواب سے بھی خوش تھی مگر وہ بھی کھوٹا نکلا۔''

آنسو پھر ٹپکنے لگے۔ ان کی نمی میں اس کی آواز دھیمی پڑ گئی۔

''تم نے گرل فرینڈز بھی بنا لیں۔ جانتے ہو اس روز تاج سے نکل کر تمہارا جینی کو گلے لگانا مجھے کیا لگا؟'' اس نے توقف کیا جیسے اس کا بتانا بھی دردناک عمل ہو۔ ''جیسے برچھی اترے، نیزے گڑیں۔۔۔ اس ایک گھاؤ کا اندازہ کر سکتے ہو، سلیم؟''

منزہ بڑی ہو چکی تھی۔ لٹریچر پڑھ چکی تھی۔ رُلا دینے والی باتیں سیکھ چکی تھی۔ پلکوں نے اُن آنکھوں کے منہ پر پھر ہاتھ رکھ لیے۔

میں ایک قدم اور آگے گیا۔

''میری آنکھوں میں دیکھو۔''

وہ بہ دستور میرے قدموں کو دیکھتی رہی۔

''اتنا پاس آ کے بھی خود کو چھپائے رکھا؟''

''پاس آنا میری مجبوری تھی، سلیم۔ خود کو تم پر تھوپنا نہیں۔''

''اب آؤ پاس!'' میں نے بازو پھیلا کر کہا۔

''کبھی نہیں!!''

''میرے ساتھ کشتی میں سفر کرو گی؟''

''نہیں۔''

''ساحلِ سمندر پہ سیر کرنے چلو گی میرے ساتھ؟''

''نہیں۔''

''کبھی کوئی چاندنی رات ڈیپ ڈیزرٹ میں بسر کرنے چلو گی؟''

''نہیں۔''

''تھل کی چراگاہوں میں بھیڑیں چراؤ گی اپنے گڈریے کے ساتھ؟''

''نہیں۔''

''بانسری بجانا سیکھو گی؟''

''نہیں۔''

''اچھا اس ہیرے کی انگوٹھی کی تو جناب نے خود خواہش فرمائی تھی۔'' میں نے اچانک ابوظہبی والی انگوٹھی نکال لی۔

اب کی بار اس کے چہرے پر وہ رنگ اترے کہ وادیِ خواب کو بھی مات ہو گئی۔

''دلہن بنو گی میری؟''

خاموشی تھی کہ لمحوں کی چاشنی سی سے لپٹ لپٹ جاتی تھی۔ آنسو جو ہمارے غم میں بین کرنے آتے ہیں، خوشی کے وقت بھی کہاں پیچھے رہ سکتے ہیں۔ باجے لے کر، پلکوں کے گال پھونک پھونک کر انہیں بجانے لگے۔

''میں اسے ہاں سمجھوں؟''

''نہیں۔''

''میں کسی اور کی بیوی بننے جا رہی ہوں۔''

منزہ اپنی انا کے لیے ایسا کہہ رہی تھی سو میں نے اسے نہ کہا کہ تم تو منع کر آئی ہو یا یہ کہ تم نے ڈائری میں سرخ قلم سے تو کچھ اور لکھا ہے۔

''وہ اس قابل نہیں ہے، منزہ۔''

''میرے بزرگ زبان دے چکے ہیں۔''

''تمہارے بزرگ میرے بھی بزرگ ہیں۔ میں انہیں منا لوں گا۔''

پلکوں کا بند پھر ٹوٹ گیا۔ حسرت کا سمندر امڈ آیا۔ وہ دیوار کے سہارے ویسے ہی فرش پر بیٹھ گئی جیسے بچپن میں مجھ سے کسی کھیل میں ہارتی تو یوں دیوار سے گھسٹتے ہوئے بیٹھ جاتی۔ مگر آج کا ہارنا ہم دونوں کی زندگی کی سب سے بڑی جیت تھا۔

''میں تم سے نفرت کرتی ہوں، سلیم۔'' اس نے محبت میں گندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''شکریہ۔''

''آج ہی سے میں تمہارے دادا کے پاس ہر روز جایا کروں گا۔اس جواری فیفو سے زیادہ خدمت کروں گا۔اُن کی سبھی شرطیں مانوں گا۔کچھ وقت لگے گا۔مگر وہ مان جائیں گے۔تم بس حوصلہ رکھنا۔اُس خواب کو کھوٹا سمجھ کر خود سے الگ مت کرنا۔''

اس نے ہلکے سے سر ہلایا۔

''اور سکول کی لیٹرین پہ جو انڈیا لکھا ہوا ہے ناں تمہارے شنکر انکل کی خاطر میں کل جا کے وہ بھی مٹا آؤں گا۔۔۔''میں نے اسے خوش کرتے ہوئے کہا۔

''گڈ بوائے!''اس نے مسکرا کے کہا۔

''گو نواز گو......''اسے ہنسانے کے لیے میں نے جہاز والے انکل یاد دلائے۔

''نئیں۔۔۔نہیں ں ں ں......گندے۔''اس نے چہرے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''اب میں اپنے رومال سے تمہارے آنسو پونچھ لوں ناں؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

میں نے آگے بڑھ کر رومال اس کے بازو پر رکھ دیا۔خود آنسو پونچھنے کی جرات اس لیے نہیں کی کہ منزہ چیخ نہ مار دے۔

''چلو یہ لو خود ہی پونچھ لو۔''

کچھ دیر میرے رومال کو اپنے بازو سے لپٹا دیکھتی رہی پھر اسے فرش پر گرا کر شریر آنکھوں سے مسکرائی اور اپنی چادر سے چہرہ صاف کیا۔میرا رومال اس کے بدن کو مَس کر چکا تھا۔میں نے اسے فرش سے اٹھایا۔سینے سے لگایا۔پھر اس کی خوش بُو سُونگھی۔پہلے ایک کونے کو چوما پھر دوسرے کو......

''پاگل۔''اس نے مسکرا کر کہا۔

میں نے رومال کو فولڈ کر کے پہلے دائیں آنکھ سے لگایا، پھر بائیں سے۔

''مجھے پہلے ہی لگ رہا تھا یہ دھمال والا لڑکا پاگل ہو گیا ہے۔''اُس نے مسکرا کے کہا۔اس کے جملے کی چاشنی، چہرے کی لالی، آنکھوں کی شرارت، لہجے کی مٹھاس، اور لہجے کی التجا مجھے دیوانہ کیے جا رہی تھی۔

اچانک میں نے رومال کو ہوا میں اچھالا، اور ہاتھ سر سے اوپر لے گیا۔

''نہیں ں ں ں ں۔۔۔''منزہ نے حیرت زدہ ہو کے کہا۔

''دھمال نہ ڈالنا۔پلیز نہیں۔بہت بُرے لگتے ہو، سلیم۔''

وہ میرے پاس آئی، پنجوں پہ کھڑے ہو کے، فضا میں بلند میری کلائیوں کو پکڑا اور مجھ سے میری آنکھوں میں دیکھ کر پوچھا:''اتنے خوش ہیں؟''

میری حالت جواب دینے والی ہوتی تو کچھ بولتا ناں۔

مجھے میری چاہت پر دادے کے وہ تو دوسرے کمرے میں چلی گئی لیکن میں جہاں تھا وہیں ٹھہر گیا۔البتہ دیوار پر لٹکی میری تصویر کو نہیں معلوم کیا ہوا کہ میرے ارد گرد گھومنے لگی اور گھومتی ہی چلی گئی۔

--☆--

اُردو ناول نگاری کی تاریخ میں "ساسا" ایک خوش گوار حیرت کی طرح منظرِ عام پر آیا ہے۔ اب تک اردو کی فکشن نگاری میں وہ کاٹ دار اور توانا نثر نظر نہیں آئی تھی، جسے 'طنزِ ملیح' کہا جا سکتا ہے اور جو مغربی ادب کا اِمتیاز ہے۔ اِسے واقعہ نگاری میں ایک واضح مگر اپنے اندر سچائی کی ایک ایسی کشش قرار دیا جا سکتا ہے، جو حقیقی معاشرے کا صحیح رنگ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر تخلیقی سحر رکھتی ہے۔ مشرق اور مغرب کی تہذیب کا تقابلی مطالعہ بہت سے لکھنے والوں کا موضوع رہا ہے مگر "ساسا" ہمیں دونوں تہذیبوں کے روز مرہ زمینی واقعات میں نئی معنویت پیدا کرتا نظر آتا ہے۔ اس میں وہ چاشنی ہے جو سچائی کو جادو بھری کیفیت عطا کرتی ہے اور سب سے بڑھ کر آج کے پر آشوب سیاسی دور میں طاقت ور قومیں جس طرح نئے ابھرتے ہوئے ممالک کو اپنے نرغے میں لے لیتی ہیں، اس کا ایک بہت موئثر نقشہ اس ناول میں دکھائی دیتا ہے، جو ہمیں اپنے زمانے کے تمام تضادات سے بھی روشناس کرواتا ہے۔

خالدہ حسین

محمد شیر از دستی کا یہ ناول بے حد دلچسپ اور سحر انگیز تحریر ہے۔ اس کا اسلوب جان دار اور منفرد ہے۔ اس میں ایک جدت، ایک تازگی ہے۔ لفظیات اور نحوی ساختوں میں نیا پن ہے جو مقامی اور حقیقی ثقافت کا پر لطف ذائقہ عطا کرتا ہے۔ کہانی کی مرکزی تھیم یعنی محبت کی تلاش قدیم ہونے کے باوجود اپنی آفاقیت کے باعث، اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ اب یہ تلاش انسانی مقاصد کے دائرے سے نارواطور پر معدوم ہوتی جارہی ہے، معنویت سے بھرپور ہے اور جدید طرزِ اظہار کے باعث دل کشی قائم رکھتی ہے۔ ضمنی طور پر جس فکری کشمکش کو پیش کیا گیا ہے وہ اپنے حقیقی اور معاصر تناظر کے باعث بہت اہم اور عصری حقائق سے براہِ راست منسلک ہے۔ مشرق و مغرب، پاکستان اور امریکہ، مذہب اور سیاست، اسلام اور جدید تہذیب؛ یہ تمام فکری دائرے ثنوی رشتوں کے طور پر پیش کیے گئے ہیں اور اپنے عہد کے سوالوں سے نبرد آزما ہونے کی کوشش کا اظہار کرتے ہیں۔ علامات کا استعمال ہوشیاری اور ذہانت سے کیا گیا ہے اور ان کے ذریعے فکری تسلسل قائم رکھا گیا ہے۔ طنز و مزاح کی آمیزش سے جدید ذہن کو متوجہ رکھنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ خاص طور پر آخری حصے میں نمایاں ہونے والی سنسنی خیزی نے اس ناول کو نوجوان نسل میں بھی مقبول بنانے کا سامان کر دیا ہے۔

ڈاکٹر نجیبہ عارف

محمد شیر از دستی کا یہ ناول جنوبی ایشیا میں استعماری قوتوں اور ان کے مقامی گماشتوں کے دو صدیوں پر پھیلے احساسِ تفاخر کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ ہے۔ ناول نگار نے نہایت چابک دستی اور مہارت کے ساتھ عصرِ جدید کی چنگیزیت کے چہرے سے مصنوعی چمک دمک کا غازہ اُتارنے کی جسارت کی ہے۔ سینۂ سنگ کو چیر کر کھلی فضا سے ہم کلام ہونے والی نرم و نازک خودرو بیلوں کی طرح عرصۂ تحقیر کے آہنی حِصار سے نکلنے کا جتن اپنی شناخت کے راستے کا پہلا سنگِ میل ہے۔ کھلی فضا سے ہم کلام ہونے کا خواب کبھی بے تعبیر نہیں رہ سکتا۔

ارشد محمود ناشاد

ربِ لامکاں کا صد شکر ہے کہ اس نے ہمیں توفیق دی کہ ہم اردو ادب کی کتب کو سافٹ میں تبدیل کر سکے۔ اسی صورت میں یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ مزید اس طرح کی عمدہ کتب حاصل کرنے کے لئے ہمارے گروپ میں شمولیت اختیار کریں۔

انتظامیہ برقی کتب

گروپ میں شمولیت کے لئے:

عبداللہ عتیق: 8848884 347 -92+

محمد ذوالقرنین حیدر: 3123050300-92+

اسکالر سدرہ طاہر صاحبہ: 0120123 334 -92+